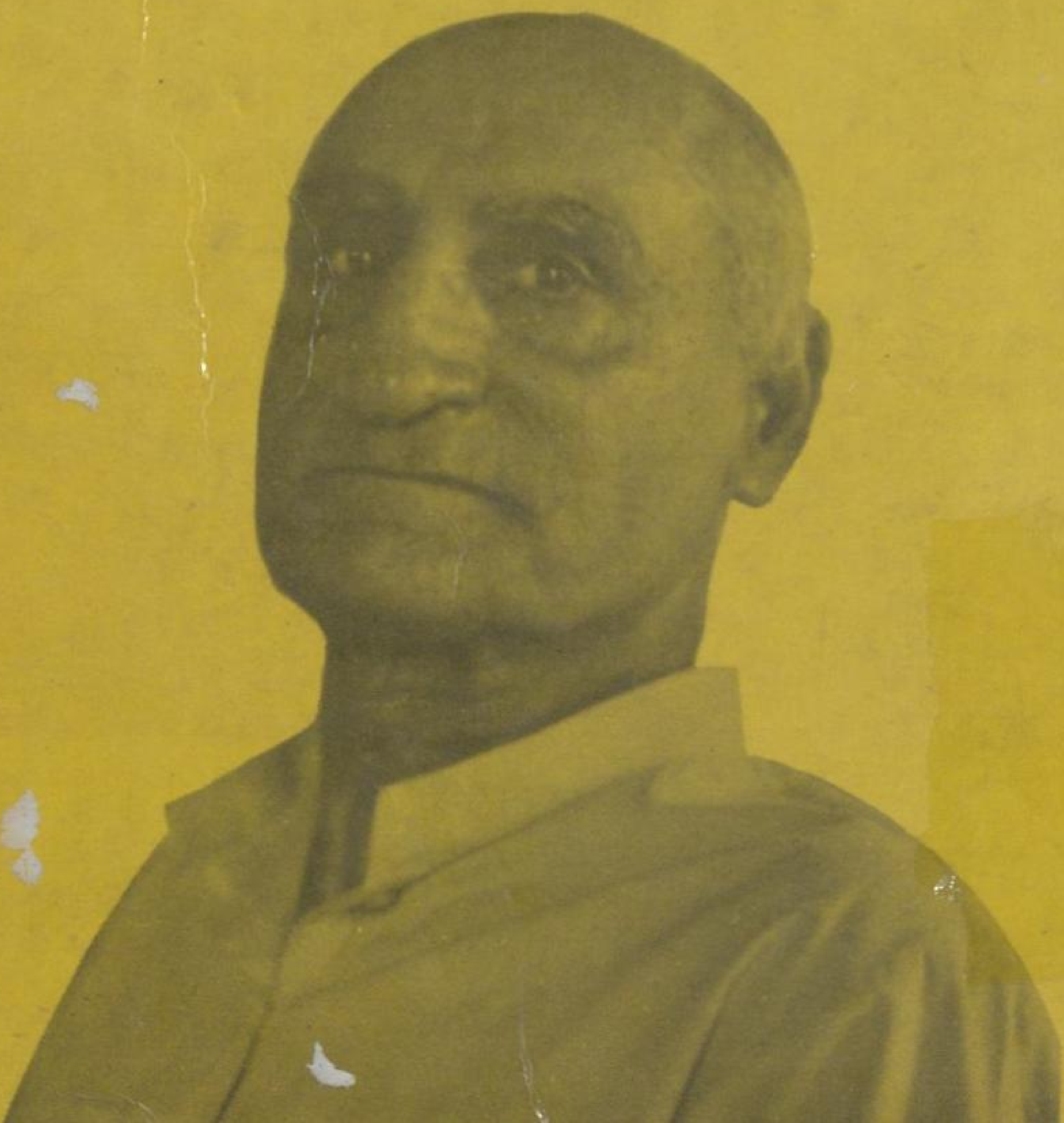
میرزا ادیب

بہترین افسانے

(انتخاب)

تجزیہ ○ تنقید ○ سوانح





میرزا ادیب نے اردو افسانے کو بہت کچھ دیا مگر اس صنف ادب میں ان کا نمایاں ترین اضافہ اردو افسانے کے کینوس کی وسعت اور رنگا رنگی ہے۔ ہمارا افسانہ جو چند گنے چنے موضوعات میں گھر کر رہ گیا تھا اور جس کے نزدیک ان مقررہ مسائل سے باہر کا ہر موضوع غیر افسانوی تھا۔ میرزا ادیب کے فن میں اس نے صحنوں سے لے کر صحراؤں تک کی مسافتیں طے کرلیں اور انسانی زندگی کا کوئی بھی لمحہ ایسا نہ رہا جو افسانے کی صورت اختیار نہ کر سکتا ہو۔

افسانے میں میرزا ادیب نے ایسے ایسے موضوعات کو اپنے فن میں سمویا کہ اگر وہ ان پر نہ لکھتے تو ممکن ہے اب تک یہ افسانے کے حلقہ اثر سے باہر ہوتے۔

پھر میرزا ادیب کے افسانوں میں بیان کی جو سلاست ہے وہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ وہ اپنی فنی گرفت پر اتراتے نہیں ہیں۔ میرزا ادیب کو بیان یا خیال کی الجھن چھو ہی نہیں گئی ان کے ذہن نے زندگی کے بنیادی مسائل کے بارے میں اپنے ہی مشاہدات و تجربات کی روشنی میں بعض فیصلے کئے ہیں۔ اور یہ فیصلے ان کے افسانوں میں ہر جگہ، تاروں کی طرح چمکتے اور پھولوں کی طرح مہکتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کا فن ان کا اپنا فن ہے اور ہماری زبان کے بہت کم فن کاروں کو میرزا ادیب کی سی انفرادیت حاصل ہے۔

احمد ندیم قاسمی

[redacted]

میرزا ادیب کے بہترین افسانے

میرزا ادیب

کے

بہترین افسانے

مرتّبہ

پروفیسر عرش صدّیقی ایم۔اے

مکتبہ میری لائبریری (ناشر، تاجر) لاہور ۲

ترتیب

حرفِ آغاز

مرزا ادیب اُردو ادب کا وہ واحد فنکار ہے جس کے فن کے ارتقائی مدارج بڑی حد تک اُردو کے پورے افسانوی ادب کے ارتقائی مدارج کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نثری افسانوی ادب میں باقاعدہ ادیب کی حیثیت سے میرزا نے سب سے پہلے وہ کہانیاں لکھیں جنہیں "رومان" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کو میں داستاں کی حیثیت دیتا ہوں۔ "صحرانورد کے خطوط" کی داستانیں لکھتے لکھتے ہی میرزا کے فن میں ایک نئی کروٹ کے امکانات نمایاں ہونے لگے تھے اور یہ نیا رجحان "صحرانورد کے رومان" میں اتنا شدید اور واضح ہے کہ اس مجموعے کی کئی کہانیاں کئی داستانی عناصر کی حامل ہونے کے باوجود داستانیں نہیں بن پائیں۔ اس نئے رجحان کی تشکیل کا دَور "سمارت کا فیدی"، "صحرا نورد کے رومان" اور "دنیائے آرزو یا خوابوں کے مسافر" پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ دور تغیر و تبدل کا دَور ہے اسی لیے دیر پا ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میرزا جدید افسانے کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے اور اس قلمرو کو وہ اپنے لیے سوادِ عظمت کا درجہ دینے میں پوری طرح کامیاب ہوتا ہے۔ "کمبل" کے دیباچے میں میرزا اچانک اعلان کر دیتا ہے کہ اب وہ افسانے نہیں لکھے گا بلکہ اپنی تمام تر تخلیقی قوتیں ڈرامے کے لیے وقف کر دے گا۔ اس وقت سے اب تک میرزا ڈراموں کی تخلیق میں مصروف ہے۔ اس مقدمے میں مجھے صرف داستانوں اور افسانوں پر ہی بحث کرنا ہے۔

میرزا کی پہلی کتاب "صحرانورد کے خطوط" ۱۹۴۰ء میں چھپی۔ یہ کتاب داستانوں کا مجموعہ ہے کیونکہ اس کی بیشتر کہانیوں میں داستان کی فضا اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ

موجود ہے۔ اردو نثر کا ابتدائی دور بیشتر دوسری زبانوں کی طرح داستانوں کا دور ہے۔ کئی زبانوں میں داستان کے ساتھ ساتھ ڈراما بھی اپنی ابتدائی صورتوں میں مقبول رہا ہے لیکن اردو ادب میں یہ صورتِ حال نہیں ہے۔ ہماری بیشتر داستانیں نثر میں لکھی گئیں برعکس یونان وغیرہ کے جہاں نظم کو وسیلۂ اظہار بنایا گیا۔ ہمارے ہاں جو تراجم دوسری زبانوں سے ہوئے وہ بھی نثر میں ہی کئے گئے۔ کلیلہ ودمنہ، طوطا کہانی، بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، مادھولال، الف لیلہ، اخوان الصفا، آرائشِ محفل، باغ و بہار ——— مذہبِ عشق، گلِ صنوبر، شگوفۂ محبت، داستانِ امیر حمزہ، بوستانِ خیال، فسانۂ عجائب، سروشِ سخن، کیتکی کی کہانی، صرف چند نام ہیں۔ ان داستانوں کی ایک طویل فہرست گیان چند کی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ سب داستانیں نثر میں ہی لکھی گئیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو ادب کا افسانوی ادب ابتدا میں نظم کی نسبت زیادہ مالا مال رہا ہے۔ نظم وہاں جلد رائج ہوتی رہی ہے جہاں رزمیہ مثنویاں لکھے جانے کے روشن امکانات موجود رہے ہیں اردو میں ایسا نہیں ہو سکا کیونکہ اردو کو وہ ماحول کبھی میسّر نہیں آسکا جو رزمیہ مثنویوں کی تخلیق و ترویج کا سبب بنتا ہے۔

مصر، یونان، چین، ہندوستان، غرضیکہ سبھی ممالک کا ابتدائی دورِ ادب دیومالاؤں اور داستانوں کا دور ہے۔ بتدریج ارتقا کے بعد یہ داستانیں ڈراما یا جدید افسانہ یا ناول کی شکل اختیار کر گئی ہیں اور تمام زبانوں میں ادب کو ان تمام منازل سے گزرنا پڑا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان منازل کی ترتیب بھی تمام زبانوں میں ایک ہی ہو۔ یونان، اٹلی اور انگلستان میں ڈراما افسانے سے پہلے مقبول ہوتا ہے لیکن اُردو زبان میں داستان کے بعد جدید افسانہ مقبول ہوا اور ڈراما اس کے بھی بعد سنسکرت زبان کا ڈراما، اردو ادب کا حصّہ نہیں بن سکا۔ اس لیے جو بات سنسکرت زبان کے ادب پر صادق آئے گی اس کا اُردو ادب کی تاریخ سے کچھ ایسا گہرا تعلق نہیں ہو سکتا۔ سنسکرت کی روایات کو اُردو ادب کو اپنا مستقل حصہ نہیں بنا سکا۔ چھوٹے موٹے ڈراموں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مگر آغا حشر کا ذکر ضروری ہے جن کی حیثیت تاریخی زیادہ ہے اور کسی اور لحاظ سے کم کیوں کہ ان کا

فن روایت کا درجہ حاصل نہیں کر سکا۔ اور پھر جب سے اُردو کو محض مسلمانوں کی زبان سمجھا جانے لگا ہے اُردو ادب ہندوستانی ڈرامے کی بیشتر روایات سے الگ ہو گیا ہے اور اب اپنی روایات آہستہ آہستہ خود بنا رہا ہے۔

میری نظر میں میرزا ایک عظیم ادیب ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اس کی ابتدا سے آج تک کی تمام تخلیقات عظیم ہیں "صحرا نورد کے رومان" اور "دنیائے آرزو" کی کہانیاں فنی طور پر عظیم نہیں ہیں حالانکہ کہانیوں کی حیثیت سے وہ بے حد دلچسپ اور مقبول ہیں۔ "دنیائے آرزو" کی کہانیاں اپنے زمانے میں عوام میں بے حد پسند کی گئی تھیں "صحرا نورد کے خطوط" کی داستانیں اور میرزا کے بیشتر جدید افسانے اس کی عظمت پر دال ہیں۔ میرزا نے آغاز ہی سے اچھی تخلیقات پیش کی ہیں۔ لیکن عموماً کسی بھی مصنف کی شروع کی تخلیقات دورِ عروج کی تخلیقات کا مقام نہیں رکھتیں۔ میرزا کی ہر تخلیق میں کوئی نہ کوئی خوبی ہے خواہ وہ کسی بھی دَور سے متعلق ہو لیکن صحیح معنوں میں عظمت اسے جدید افسانے نے ہی دی ہے۔ میرزا کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ابھی تک اس کا فن کسی جگہ رکنے نہیں پایا۔ یہ اس کا کمال ہے کہ اس نے ہر اس صنف میں کمال حاصل کیا جس پر اس نے توجہ صرف کی۔

میرزا کے فن میں جو تبدیلیاں آتی رہی ہیں وہ زیادہ تر تکنیکی تبدیلیاں ہیں۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے میرزا کے ہاں صرف ایک بار یہ تبدیلی آئی اور اس کے موضوع مستقل حیثیت اختیار کر گئے۔ "صحرا نورد کے خطوط" دلکش روایتی داستانوں کا مجموعہ ہے لیکن "صحرا نورد کے رومان" تک پہنچتے پہنچتے میرزا کا موضوع روایتی عشق سے ہٹ کر انسانی معاشرے کی خرابیاں اور بالخصوص مختلف صورتوں میں روا رکھا جانے والا ظلم بن جاتا ہے اور آج تک اس کا یہی موضوع ہے۔ محبت کا موضوع اگر کہیں آتا ہے تو وہ بھی ظلم کے اس منظر سے ہی ابھرتا ہے۔ "صحرا نورد کے رومان" میں داستان کا رنگ بہت پھیکا ہے۔ "دنیائے آرزو" معاشرے پر ایک کامنٹری ہے۔ "صحرا نورد کے رومان" میں "صحرا نورد کے خطوط" کی تکنیک اور "دنیائے آرزو" کے موضوعات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ گویا میرزا کی کشت زارِ دل میں جدید افسانے کے بیج اسی وقت بوئے جا چکے تھے جب وہ "سیلِ حوادث" اور "سمارت کا قیدی" جیسی داستانیں لکھ رہا

تھا۔ داستان کے جملہ عناصر پر مکمل بحث کا یہ موقعہ نہیں۔ اس موضوع پر میں نے اپنی کتاب "میرزا ادیب اور اس کا فن" میں تفصیلی بحث کی ہے۔ یہاں چند اشاروں پر ہی اکتفا کروں گا۔ داستان کا بنیادی مقصد تفریح سمجھا گیا ہے یوں حصولِ مسرّت یا تفریح ایک حد تک ہر صنفِ ادب کا ایک مقصد ضرور ہوتا ہے لیکن بعض اصناف میں کوئی اور مقصد اس مقصد پر حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن داستان میں عموماً تفریح ہی سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ ذہین قاری ان داستانوں میں زندگی کے اسرار تلاش کر لیتا ہے۔ عموماً داستان میں منطقی استدلال، عقلی و نفسیاتی نکتہ آفرینی اور تجزیہ کو دخل نہیں ہوتا۔ داستان کی دنیا ایک تصوراتی دنیا ہوتی ہے۔ رومانی فضا میں خیر و شر کے جھگڑے طے پاتے ہیں یوں کہ فتح ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے۔ اور قاری تسکین حاصل کرتا ہے۔ انسان کی آرزوئیں جب زندگی میں پوری نہیں ہوتیں تو وہ معجزوں کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ مافوق الفطرت واقعات سے داستانیں بھری پڑی ہیں۔ پُراسرار اور تحیّر انگیز فضا اسی لیے داستان کا لازمہ بن گئی ہے۔ کہ یہ مافوق الفطرت عنصر کا لازمی نتیجہ ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ داستان پڑھنے کے بعد جو اہم ترین بات ذہن میں رہ جاتی ہے وہ داستان کی تحیر انگیز، پُراسرار، رومانی، مافوق الفطرت قسم کی اجنبی فضا ہے۔ جہاں انسان ناممکن کو ممکن محسوس کرتا ہے۔

"صحرانورد کے خطوط" کی بیشتر داستانوں میں یہ عناصر اور یہ فضا موجود ہے لیکن وقت کے تقاضوں کے مطابق میرزا نے چند تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ میرزا کے پیشِ نظر داستان کی فضا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آج کا ذہین قاری محض مافوق الفطرت عنصر پر یقین نہیں رکھتا اور اسے جنوں، پریوں کی کہانیوں اور معجزوں کے ذکر سے نہیں بہلایا جا سکتا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ داستان قصّہ گوئی کا دلچسپ ترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ میرزا نے مافوق الفطرت عنصر اور واقعات سے دامن بچایا اور یہی فضا بعض دوسرے ذرائع سے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور یوں اس کی داستانیں داستانوں کا پورا مزا دیتی ہیں۔ یہ فضا پیدا کرنے کا بہت کارآمد اور اہم ذریعہ جو اس نے اختیار کیا ہے کہ وہ قاری کو ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جو اس کی روزمرہ کی دنیا سے بالکل مختلف ہے، بہت دُور ہے اور جسے اس نے یا تو دیکھا نہیں یا محض اس کی چند

جھلکیاں ہی دیکھی ہیں لیکن اسے دیکھنے کا وہ ہمیشہ آرزومند رہا ہے۔ کوئی زمانہ، شے، یا شخص بلحاظِ وقت یا فاصلہ ہم سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی رومانی فضا کا لباس اس کے گرد مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ میرزا نے اس اصول کو سمجھا اور استعمال کیا ہے۔ بادشاہ وغیرہ آج کے ماحول کا حصہ نہیں ہیں اور کھنڈر روزمرہ زندگی کا حصہ نہیں ہیں بلکہ ماضی کی یادگاریں ہیں جو ہمیں ماضی میں لے جاتی ہیں۔ میرزا ان کے ذریعہ اجنبی سی فضا پیدا کر لیتا ہے۔ پھر میرزا کی داستانوں میں تجزیہ اور منطقی و عقلی استدلال بہت کم ہے۔ عشق یہاں بھی ایک کھیل ہے۔ داستان خواہ دخترِ صحرا کی ہو یا ملکۂ مصر کی، بابل کی سمیرا کی ہو یا سمارت کے پاشا کی عقل کے مقابلے میں عشق ہر جگہ طوفان برپا کئے ہوئے ہے۔ ان داستانوں میں جدید افسانے کی حقیقت پسندی اور تجربے کا بارِ گراں اٹھانے کی سکت نہیں۔ داستان اردو نثر کی صنفِ نازک ہے۔

پھر صحرانورد کا نام ہی ہمیں کسی رومانی، اجنبی دنیا میں لے جاتا ہے۔ صحرانورد کا کردار اس لحاظ سے بہت کامیاب ہے کہ یہ رومانی اور داستانی فضا پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کا مقابلہ بآسانی سندباد جہازی سے کیا جا سکتا ہے۔ صحرانورد کا نام ذہن میں آتے ہی ایک نئی، اجنبی، دور افتادہ دُنیا کا تصور ذہن میں جاگ اٹھتا ہے۔ صحرا اس بیکراں زندگی کی علامت بن جاتا ہے جس کی داستانیں وہ اپنے دوست کو لکھ کر بھیجتا ہے۔ اس نے جہاں بھی صحرا کی وسعتوں کا ذکر کیا ہے قاری کچھ دیر کے لیے اردگرد پھیلی ہوئی روزمرہ کی دنیا کو بھول جاتا ہے۔

داستان کی فضا پیدا کرنے کے لیے میرزا نے ایک مخصوص پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے۔ جہاں مافوق الفطرت عنصر سے دامن کشی شرط ہو اور محض فنی کمال اور اسلوب پر ہی تکیہ ہو وہاں کام دشوار ہو جاتا ہے۔ میرزا اس امتحان میں پورا اُترا ہے اور ذرائع کے علاوہ میرزا نے اجنبی ناموں کے استعمال سے بھی یہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ درج ذیل چند نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :-

حنیشو، سمارت، حمدی، بلامیر، ہرمز، نرمان، زمورت، عطفہ، نورورزہ، آگیطی، حمورت وغیرہ۔

یوں میرزا کی ان داستانوں میں تحیّر اور اسرار کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور واقعات کی پیشکش

کا انداز اس فضا کو مافوق الفطرت ایسا بھی بنا دیتا ہے لیکن اس کے باوجود میرزا کے کردار طلسم ہوشربا یا دیومالاؤں کے کردار نہیں ہیں۔ یہ کردار ہماری جیتی جاگتی دنیا کے باشندے ہیں۔ میرزا نے داستان کی روایت کا احترام کرتے ہوئے تجزیہ نفس سے ان داستانوں میں اجتناب کیا ہے۔ لیکن وہ محض روایات کا غلام نہیں بن سکا۔

داستانیں طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔ الگ الگ بھی اور قصہ در قصہ، داستان در داستان بھی۔ میرزا کی داستانیں مختصر ہیں۔

خیر و شر کی جنگ پرانی داستانوں کا اہم موضوع ہوا کرتا تھا۔ میرزا کے ہاں یہ موضوع روایتی انداز میں بھی پیش ہوا ہے اور نئے انداز میں بھی۔ دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے یہی میرزا کا مستقل موضوع ہے۔ وہ اعلیٰ اقدار کا علمبردار ہے اور برائی، ظلم اور معاشرتی ناہمواری کا دشمن ہے۔ یہ موضوع صحرانورد کے رومان، میں ملے جلے انداز سے پیش ہوا ہے۔ یعنی کچھ جدید، کچھ قدیم جبکہ "صحرانورد کے خطوط" کی بیشتر داستانیں روایت کی اساس پر کھڑی ہیں "صحرانورد کے رومان" کی کہانیوں میں جہاں داستان کی رومانی فضا ایک حد تک موجود ہے وہاں ایک خاص سماجی مقصد بھی ان میں شامل ہے۔ گو ان داستانوں کا حسن اس بارِ گراں سے مجروح ضرور ہوا ہے لیکن اپنی جگہ ان میں بھی بے حد دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ یہ کہانیاں محض رومانی، تحیّر آفریں، سحر آلود واقعات کا ایک طویل سلسلہ، عشق و محبت کی بے سروپا داستانیں اس لیے نہیں ہیں کہ صاحبِ فکر و نظر فن کار کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے آنکھیں بند کرلے۔ آج محض عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے شہزادوں اور شہزادیوں کی کہانیاں ہماری تسکین کا سامان اس وقت تک نہیں بن سکتیں جب تک ان میں بعض معاشرتی، انسانی یا نفسیاتی مسائل کے شعور کا احساس موجود نہ ہو۔ میرزا کی ان کہانیوں میں، اور جدید افسانوں میں بھی، نئے ماحول کا شعور، نئی زندگی اور زندگی سے کبھی نہ ٹوٹنے والے رشتے کا احساس بڑی شدت سے موجود ہے۔ اسی لئے وہ ظلم اور رنج سے نڈھال ہوکر راہِ فرار اختیار نہیں کرلیتا بلکہ علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔ یوں تو یہ زمین سے رشتہ کسی نہ کسی طرح ہر تخلیق میں نظر آسکتا ہے لیکن میرزا

ان فنکاروں میں سے ہے جنہیں اس رشتے کا شعور بھی ہوتا ہے۔ میرزا کے ہاں شعور اور لاشعور ایک دوسرے کے معاون بن کر کام کرتے ہیں۔ اور یہ ان لوگوں کا انداز ہوتا ہے جو شہرِ عظمت کی راہوں پر گامزن ہوتے ہیں۔ جوں جوں میرزا کی زندگی آگے بڑھتی گئی اور اس کا زندگی کا تجربہ اور مشاہدہ ترقی کرتا گیا توں توں اسے اپنے معاشرے میں چاروں جانب پھیلے ہوئے طرح طرح کے ظلم کا احساس شدید سے شدید تر ہونے لگا۔ قبل از جنگ کی بیکاری، دورانِ جنگ کی بے بسی اور بعد از جنگ کی ہولناکی کے نتائج میں پیدا ہونے والی معاشی زبوں حالی، اور بے اطمینانی نے اس کا سکھ چین لوٹ لیا اور اہلِ ہند کے دلوں میں اپنے غیر ملکی حکام کے خلاف لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی نفرت نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ اور یہ احساس کہ بہت سے ہندوستانی غلامی کی زنجیروں کو سامانِ آرائش سمجھ کر ان سے پیار کرنے لگے ہیں اس کے لیے سخت تکلیف دہ بن گیا۔ مذہب کی گرفت لوگوں کے دل و دماغ پر کمزور پڑتی ہوئی اسے صاف نظر آ رہی تھی، اس کے چاروں جانب ایک نفسا نفسی کا عالم تھا۔ خود غرضی اور بے حسی اور ظالم کو قبول کر کے بیٹھ جانے اور برداشت کرتے رہنے سے پیدا ہونے والی فضا اس کے دل و دماغ پر ہر لحظہ نشتر زنی کرنے لگی۔ چنانچہ یہ تمام جذبات اس شدت سے اُبھرے کہ اب اس کے فن کا مقصد تفریح نہ رہا۔ پرانی داستانوں میں معاشرے کے آلام اور خامیوں اور اجتماعی، ملکی جذبوں کا شعور ضروری نہیں ہوتا تھا لیکن "صحرانورد کے رومان" کی کہانیوں میں یہ شعور اس شدت سے در آیا کہ فن اور موضوع کی ہم آہنگی مجروح ہو کر رہ گئی۔ یہاں وہ ایک باغی کی طرح اُٹھا ہے۔ یہاں اصلاح کا جذبہ نہ صرف غالب ہے بلکہ بار بار مختلف کردار واشگاف انداز سے اس کا ایک واعظ کی طرح اظہار بھی کرتے ہیں۔ یہ ضرورت سے زیادہ سنجیدگی ہی "صحرانورد کے رومان" کی کہانیوں کا نقص بن جاتی ہے۔ جابر حکمران اور دوسرے مظالم کے خلاف جو جذبہ اُبھرا تھا اس پر کسی قسم کی پابندی اس کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ یہ سچے مصلح کا جذبہ تھا۔ فن کار کا نہیں۔ اصلاح ایک عظیم مقصد ہے اور فن بھی اس مقصد کا ذریعہ بن سکتا ہے لیکن آئیڈیل کا واشگاف اور بار بار اعلان فن پارے کا نقص بن جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کہانیوں میں فن کار اُونگھ رہا ہے اور مصلح پوری طرح

بیدار ہے۔ توازن اور ہم آہنگی کی یہ کمی محض عارضی تھی اور میرزا نے بعدازاں اپنے افسانوں میں یہ توازن اور موضوع اور فن کی مکمل ہم آہنگی قائم کر لی۔

اس دور میں سے میں نے میرزا کی دو کہانیاں منتخب کی ہیں۔ "ملکہ مصر" اور "مقدس درخت"۔ پہلی کہانی روایتی داستان کے انداز پر لکھی گئی ہے اور "صحرانورد کے خطوط" میں سے لی گئی ہے۔ دوسری کہانی میں جہاں ایک حد تک داستان کا اثر موجود ہے وہاں اس میں معاشرتی مسائل کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔ یہ دونوں داستانیں اپنے اپنے انداز میں منفرد ہیں اور ان پر کچھ بحث بے جا نہ ہوگی۔

"ملکہ مصر" صحرانورد کے خطوط کی تیسری داستان ہے۔ "صحرانورد" اور "دخترِ صحرا" ایسے ناموں کی طرح آغازِ داستان ہی میں یہ نام بھی اجنبیت کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ مصر سے لاتعداد پُراسرار کہانیاں وابستہ ہیں۔ جیسے کوہ قاف کا نام لیتے ہی جنوں پریوں کی وہ تمام کہانیاں ذہن میں ابھر آتی ہیں جو اس سے متعلق ہیں۔ اسی طرح سے داستان میں مصر کا ذکر بھی ایسا ہی تاثر پیدا کرتا ہے۔ ہم اس داستان کے زمانے سے بہت دور ہیں اور مصر و یونان بالخصوص پرانے مصر و یونان کا ذکر ہمارے لیے اتنا ہی رومانی ہے جتنا کوہ قاف یا پرانے چین کا۔ فرعون کا نام بذاتِ خود داستانی روایت کا حصہ ہے۔ اس داستان کا پورا ماحول مع جزئیات کے اس قدر رومانی، داستانی اور روایتی ہے کہ یہ داستان، داستان کے عہدِ زریں کی تخلیق معلوم ہونے لگتی ہے۔

"معبدِ رع" رومانی ماضی کا اشارہ ہے۔ فرعون کے تہہ خانے میں حنوط شدہ لاشیں پڑی ہیں۔ بڑا اجنبی ماحول ہے۔ عموس، اگیلی، میرون، نفرتتی، زاعموت، رقاصہ آتشی ایسے نام اجنبیت کی فضا کو آخیر تک سنبھالے رکھتے ہیں۔ ناموں کا اثر اس داستان میں بہت شدید ہے شاہی جشن اور شان و شوکت اور طاقت کے مظاہرے عام ہیں۔ قتل و غارت جو اکثر مطلق العنان بادشاہوں کا شیوہ رہا ہے اور سازشیں جو ان کے درباروں سے ہمیشہ مخصوص رہی ہیں اس داستاں کے پس منظر میں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ تحیر کی فضا پیدا کرنے کے لیے مصنف نے تمام ممکن ذرائع استعمال کر لیے ہیں۔ مافوق الفطرت عنصر یہاں بلا واسطہ موجود ہے۔ معبدِ رع کا کاہن پیشن گوئی کرتا ہے جو حرف بحرف درست ثابت ہوتی ہے اور اس

پیشنگوئی پر داستان کے آخری اور اہم ترین حصوں کا دار و مدار ہے۔ تحیر کی فضا پوری داستان پر طاری ہے۔ موضوع اور ماحول ہی ایسا ہے کہ اگر مصنّف زیادہ کوشش نہ بھی کرتا تو بھی بڑی حد تک یہ فضا قائم ہو جاتی لیکن میرزا نے دوسرے ذرائع استعمال کر کے اس فضا کو شدید تر بنا دیا ہے۔ ذئون کی لاش مکمل حنوط کے لیے ایک تہہ خانے میں پڑی ہے آگیٹی سے ہماری ملاقات اسی جگہ ہوتی ہے۔ یہاں اسے دور کرنے میں دو سائے نظر آتے ہیں۔ سارا ماحول پُراسرار اور اجنبی ہے اور آغازِ داستان ہی میں قاری کے ذہن پر یوں مسلط ہو جاتا ہے کہ آخیر تک ساتھ چلتا ہے۔

تحیر کی اس فضا کا احساس تو صحرا نورد کے خط کے مطالعے سے ہی ہونے لگتا ہے۔ درج ذیل اقتباس اس امر کی وضاحت کے لیے نقل کرتا ہوں:

"آج تمہارے دور افتادہ صحرا نورد دوست کو تمہاری شورش افزا دنیا کے دلچسپ مناظر کو چھوڑے ہوئے پورے تین سال گزر چکے ہیں۔ ان تین سالوں میں میری نگاہوں نے ہیبت آفریں صحراؤں، ہولناک پہاڑوں، مٹی اور ریت کے مہیب تودوں، گنجان اور بلند درختوں کے علاوہ شاذو نادر ہی کوئی چیز دیکھی ہے۔ اب مجھے قدرت کے ان لرزہ خیز مناظر سے محبت سی ہو گئی ہے۔ اور جیسے جیسے میرے قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں نئے سے نئے حیرت انگیز واقعات سامنے آتے ہیں۔ دوست! میں ایک ایسی دلآویز رومانیت انگیز دنیا میں سانس لے رہا ہوں جس کی دلچسپیاں تمہارے تصورات سے بھی بالاتر ہیں۔"

یوں معلوم ہوتا ہے جیسے صحرا نورد فی الواقع کسی اور دنیا سے بول رہا ہے، ایسی دنیا سے جو ہماری روزمرہ کی دُنیا سے بہت مختلف ہے اور جہاں قدم قدم پر تحیر آفریں واقعات سے سابقہ پڑتا ہے۔

صحرا نورد تک یہ کہانی جس ذریعے سے پہونچی ہے وہ بھی بہت پراسرار اور دلچسپ ہے۔ صحرا میں بادِ سموم کے جھونکے آندھی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں فضا تاریک ہو جاتی ہے۔ آندھی میں ایسا شور بپا ہے جیسے بلائیں چیخ رہی ہوں۔ آخر

آندھی تھم جاتی ہے اور ریت بیٹھ جاتی ہے وہ اپنے ساتھی بہرام کو آواز دیتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ جھونپڑی میں اس کے علاوہ ایک پر اسرار شخص جو بہت بوڑھا ہے موجود ہے یوں لگتا ہے جیسے طلسم ہوشربا کا کوئی کردار اپنی آمد کا اعلان کر رہا ہو۔ جیسے پرانی جنّوں اور بھوتوں کی کہانیوں کا کوئی دیو بڑھتا آرہا ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے یہ آندھیاں صحرا کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں اور بوڑھے کا وہاں اس وقت ملنا محض اتفاق ہے۔ مصنّف کے قلم سے اس واقعہ کا ذکر یوں ہوا ہے کہ داستان کو مافوق الفطرت واقعات کے بغیر ہی مافوق الفطرت فضا حاصل ہو گئی ہے۔ یہی وہ بوڑھا ہے جو صحرا نورد کو ملکۂ مصر کی داستان کا مسودہ دیتا ہے۔

"مقدس درخت" کی ابتدا میں صحرانورد نے جو خط اپنے دوست کے نام لکھا ہے اس میں اسے "صحرا کی داستان" اور "طویل رومان" کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ جہاں تک موضوع کی سنجیدگی اور ثقالت کا تعلق ہے یہ کہانی "مقدس دیوی" کے زمرے میں شامل ہوتی ہے۔ اسمیں داستان کے عناصر موجود ضرور ہیں، لیکن بے حد کمزور ہو چکے ہیں۔ ہاں طرزِ بیان اور تخیل کی رنگ آمیزی سے جو فضا پیدا ہوئی ہے وہ بڑی حد تک داستان کی فضا سے ملتی جلتی ہے۔ صحرانورد کا خط مضمون کا رنگ لیے ہوئے ہے اور وہ انکشاف اور واضح انداز میں موضوع کا تعین کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اس داستان کا مصنّف داستان گو کم ہے اور مصلح زیادہ۔ موضوع کے تعین کے بارے میں ذیل کے چند اقتباسات کا مطالعہ ضروری سا معلوم ہوتا ہے:

> "ظلم اور مظلومیت کا تصادم صرف شہری دنیا ہی تک محدود نہیں۔ اس کا وجودِ ملعونہ بے آب و گیاہ زمین پر بھی پایا جاتا ہے اور بعض اوقات تو تہذیب و تمدن سے ناآشنائے محض ہستیاں ایسا ایسا ظلم کرتی ہیں، اور انسانوں کو ایسے ایسے بے رحمانہ طریقوں سے ہلاک کرتی ہیں کہ شہر کے ظالم ترین دل و دماغ بھی ان کا ذکر سن کر کانپ اٹھیں۔"

اور

"........ اگر شہروں میں حصولِ مراتب کی ہوس، سوسائٹی کے نظام کی سخت گیری اور سرمائے کی سخت غیر منصفانہ تقسیم کے سائے میں انسانیت کی بوٹیاں نوچی جاتی ہیں تو لق و دق صحرا کے سینے پر بھی مذہبی اوہام کے دامن میں انسانیت کی رگیں کاٹی جاتی ہیں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ظلم و مظلومیت کے باب میں جو کچھ تہذیب و تمدن کی بلندیوں پہ ہوتا ہے۔ وہی وحشت و بربریت کی گود میں بھی ہوتا ہے۔ پھر جس طرح شہروں میں طلسمِ سامری توڑنے کے لیے کسی موسےٰ کی ذاتِ مقدس کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی طرح ان وحشت و درندگی کی پرورش گاہوں یعنی صحراؤں میں بھی ظلم کا خاتمہ کرنے کے لیے وحشی انسانوں میں سے ایک وحشی انسان میدانِ عمل میں کود پڑتا ہے اور اپنے مقصد پر اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ یہ داستان میرے اس بیان کی تصدیق کرے گی اور یقیناً تمہیں بھی اس کی صداقت کا قائل ہونا پڑے گا۔"

گویا یہ داستان ظلم کے خلاف ایک آواز ہے اور اس مجموعے کی دوسری کہانیوں کی طرح یہ بھی نوعِ انسانی معاشرے کی اصلاح کا مقصد لے کر آئی ہے۔ اس داستان میں داستانی رنگ کے علاوہ موضوع و تکنیک کی ہم آہنگی صحرانورد کے خطوط کے واشگاف انداز کے باوجود قائم ہے۔ ایک درخت نے دیوی یا دیوتا کا روپ دھار لیا ہے۔ مذہب کے لبادے میں جو خونخوار اور خود غرض بھیڑیئے معاشرے پر حکومت کرتے ہیں پجاری ان کا نمائندہ ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ نیکی کے گھر سے بدی اور بدی کے گھر سے نیکی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ آذر کے گھر ابراہیم پیدا ہوئے اور پجاری کے گھر سمرم پیدا ہوتا ہے۔ جو جھوٹے خدا "راتئے" کے طلسم کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ بنتا ہے۔

اس داستان کا ایک اور موضوع عورت کی بے بسی ہے۔ عورت کی بے بسی بھی ظلم کی ایک شکل ہے۔ رتاصہ، مزینہ، حمارت، امنہ اور دوسری نوجوان لڑکیاں کسی نہ کسی طرح ظلم کی چکی میں پس رہی ہیں لیکن داستان میں یہ خیال پوری طرح سمویا ہوا ہے کہ

عورتوں ہی پر کیا موقوف ہے ظلم کی چکی میں تو سارا جہان پس رہا ہے۔ میرزا ظلم کی قسمیں نہیں بتاتا وہ تو ہر ظلم کو صرف ظلم سمجھتا ہے اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے راشے مذہبی ظلم کی علامت ہے لیکن ظلم کا درخت کتنا بھی مضبوط ہو قربانی اور بغاوت کی آگ اسے جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں خیر کو شر پر ضرور فتح حاصل ہوتی ہے۔ یوں گویا اس داستان کا رشتہ پھر روایت سے قائم نظر آتا ہے۔

مافوق الفطرت عنصر اس داستان میں بلا واسطہ موجود نہیں ہے لیکن "راشے" کی پرستش اور آندھی کی آمد وغیرہ کو کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ فضا پراسراری بن جاتی ہے واقعات غیر منطقی ہیں اور اچانک پیش آجانے کی وجہ سے مافوق الفطرت معلوم ہوتے ہیں لیکن اسرار کے بادل چھٹتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز بھی مافوق الفطرت نہ تھی۔ قربانی کا یکایک غائب ہو جانا، حمارت کا زخمی ہو جانا، استہ کے باپ کا قتل، تاریکی میں سایوں کا نظر آنا، سنسان فضاؤں کا بوجھل سا ہو جانا، جھونپڑی کا نذرِ آتش ہونا اور اس میں سے کسی عورت کا بھاگتے ہوئے نظر آنا۔ تمام واقعات ابتدا میں مافوق الفطرت اور غیر منطقی معلوم ہوتے ہیں اور تحیر کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ آخیر میں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مصنوعی ذرائع سے مافوق الفطرت قسم کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

یحو، راشے، ہنوشی، راسام، غنوبونا، حمارت، نمرو، مزینہ، نمو، بلام، غنونی باما، سلطی، تماچی، ورت، سمرم، استہ اور یموق وغیرہ قسم کے ناموں سے اجنبیت کا احساس پیدا کرنے کی شعوری کوشش بھی موجود ہے۔

عشق کی بلاخیزی اور راہِ عشق کی دشواری داستان کا ایک اہم عنصر ہے جو یہاں بھی موجود ہے۔ سمرم کا عشق داستانی اور روایتی ہے اور وہ قدم قدم پر مشکلات اور خطرات سے دوچار ہے۔

(۲)

داستان کے اسلوب کا جادو اور تخیلاتی دنیاؤں کی کشش میرزا کو زیادہ دیر اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکی۔ ہو سکتا ہے کہ شروع میں داستاں کی طرف میرزا کا رجحان فرار کے عارضی

جذبے کا نتیجہ ہو لیکن اگر یہ درست بھی ہو تو بھی یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ میرزا فرار کی دلدل سے بہت جلد باہر نکل کر معاشرے کی تمام طاغوتی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہو گیا۔ بنیادی طور پر وہ حقیقت پسند اور حقیقت بیں تھا۔ وہ ان بے مایہ لوگوں میں سے نہیں تھا جو ایک بار فرار کے چکر یا رومان کی دلدل میں پھنس کر اسی کے ہو رہتے ہیں۔ رومان تسکین بخش ہے اور سرچشمۂ مسرت بھی ہے لیکن اس کی ضرورت سے زیادہ محبت فن کو حقیقت سے دور لے جاتی ہے۔ صرف اس کی مناسب آمیزش ہی فن میں حسن پیدا کر سکتی ہے۔ ایسنس (ESSENCE) کی زیادہ مقدار ہر شے کو بدمزہ کر دیتی ہے اسی طرح رومان پر ضرورت سے زیادہ توجہ فن پارے کو حقیقت سے دور رکھتی ہے۔ جدید افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حقیقت پسندی اور تخیل کی رنگ آمیزی کی انتہائی مناسب آمیزش ہوتی ہے۔ اس آمیزش کا تناسب مختلف افراد میں مختلف ضرور ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بیشتر حقیقت پسند ادیب بھی کسی نہ کسی لحاظ سے، کسی نہ کسی حد تک رومانی ضرور ہوتے ہیں اور دنیا کا تمام عظیم ادب رومان کی آمیزش کے بغیر تخلیق نہیں ہو سکا۔ آج رومان ہدفِ ملامت صرف اس صورت میں بنتا ہے کہ محض رومان ہی اوّل و آخر مقصد ہو کر رہ جائے۔ دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے ہر ادب کے بیشتر بڑے ادیب کسی نہ کسی لحاظ سے رومانی ہیں۔ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم جو اردو افسانہ کے ابتدائی دور سے متعلق ہیں۔ رومانی ہیں اور حقیقت پسند بھی۔ یہی حال کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کا ہے۔ وہ جدید ضرور ہیں، لیکن رومان سے انھوں نے قطعی طور پر رشتہ نہیں توڑا۔ جدید افسانہ محض حصولِ حظ یا محض جذبات کی سستی تسکین پر اکتفا نہیں کرتا۔ آج زندگی کی وسعتوں اور گہرائیوں کے شعور کے ساتھ ساتھ فن کے پیرایہ ہائے اظہار بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ اور فن کار اپنی اہلیت اور تجربے کے مطابق زندگی کے مختلف النوع حقائق کی پردہ کشائی کا کام بھی کرتا ہے اور جمالیاتی حظ بھی پیدا کرتا ہے۔ واقعات، ماحول، کردار، جذبات اور احساسات کی تصویر کشی کے علاوہ وہ ان کے پس منظر میں کام کرنے والی پیچیدہ قوتوں اور محرکات کا تجزیہ بھی کرتا ہے اور فرد کی ذاتی زندگی کے علاوہ اس کے

اجتماعی رشتوں کا مطالعہ بھی کرتا ہے۔ ہمارے افسانوں میں زندگی کا شعور تین صورتوں میں نظر آتا ہے۔

(۱) پھیلاؤ کی صورت میں

(۲) گہرائی کی صورت میں

(۳) پھیلاؤ اور گہرائی ہر دو کی صورت میں

پھیلاؤ کی صورت یہ ہے کہ فن کار ایک ہی قسم کے واقعات یا کردار یا ماحول سے متعلق واقعات اور حقائق کی ایک طویل فہرست مہیا کرنے پر اکتفا کرتا ہے یا زندگی کے ظاہری تنوع کی رنگا رنگ تصویریں پیش کر دیتا ہے۔ گہرائی کی صورت یہ ہے کہ مصنف ہر واقعہ اور ہر کردار کا تجزیہ کرتا ہے اور بنیادی عوامل اور محرکات کی نشان دہی کرتا ہوا زندگی کی پوشیدہ قوتوں اور حقیقتوں کو سمجھنے میں قاری کی راہنمائی کرتا ہے۔ ایسا مصنف حادثات و واقعات پر تکیہ نہیں کرتا بلکہ واقعات میں ایک حقیقت پسندانہ منطقی تعلق تلاش کرتا ہے۔ پھیلاؤ محض ظاہری یا بیرونی شے ہے اور گہرائی روح کا سا درجہ رکھتی ہے۔ گہرائی اوپری شے نہیں ہے۔ اس کا احساس دلانا ہی فن کار کا کمال ہے۔ ہمیں کئی بار محسوس ہوتا ہے کہ کردار و واقعات و مناظر محض اشارے ہیں کسی اور حقیقت کی طرف جو ان اشاروں کے پردوں میں نہاں ہے۔ عام آنکھ ان کو نہیں دیکھ سکتی۔ صاحب نظر فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ ان حقائق کو اس انداز سے نمایاں کرتا ہے کہ قاری حقائق کے شعور کے ساتھ ساتھ مسرت بھی حاصل کرتا ہے۔ زندگی میں ہر شے کی طرح ہر صنفِ ادب اور ہر فن کی کچھ حدود ہیں جن سے تجاوز گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اشارے اور علامتیں ادب و فن کا حسن ہیں لیکن بعض شاعر اور ادیب اشاروں اور علامتوں کو اتنا مبہم بنا دیتے ہیں کہ ان کے ہاں فنی توازن قائم نہیں رہتا اور فن پارہ پہیلی بن جاتا ہے۔ یہ لوگ نہ تو زندگی کا مشاہدہ رکھتے ہیں نہ تجربہ۔ عموماً ان کا علم محض کتابی ہوتا ہے۔ تخیل کے جالے کی مکڑی کی طرح وہ اپنے اردگرد ایسی علامتوں اور اشاروں کا جال بنتے رہتے ہیں جو کسی طرح بھی قابل قدر نہیں ہوتیں۔ انھوں نے سن رکھا ہوتا ہے یا کہیں پڑھا ہوتا ہے۔

کہ زندگی کی گہرائیوں کو اشاروں اور علامتوں کے ذریعے نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ اور یوں فن میں کچھ اشکال ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس بات کا سہارا لے کر وہ فن کو معمّہ بنا ڈالتے ہیں۔ ایسے لوگ قاری کی کسی گہرائی، کسی حقیقت کی طرف صحیح راہنمائی نہیں کر سکتے۔ جو شخص واقعی زندگی کی گہرائیوں سے واقف ہے اور حقیقتوں کا شعور رکھتا ہے اس کا فن کبھی بے معنی اور گنجلک نہیں ہوگا اور اسے سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اگر فنکار کے پاس کہنے کے لیے واقعی کوئی بات ہے اور وہ قوتِ اظہار بھی رکھتا ہے تو وہ ایک صاف خیال، یا کسی شئے کا ایک واضح تصور دینے میں کبھی ناکام نہیں رہتا۔ اور اگر اس کے ذہن میں دائروں کے لاانتہا سلسلوں اور مکڑی کے جالوں کے سوا کچھ نہیں ہے تو وہ ہمیں پریشان کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ فن کار کی معراج یہ ہے کہ اس کی نظر زندگی کے پھیلاؤ اور گہرائی ہر دو سے آشنا ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی مصنّف زندگی کے کسی ایک پہلو کی گہرائیوں سے پوری طرح واقف ہوتا ہے اور یہ بھی کہ وہ زندگی کے جملہ مختلف پہلوؤں پر فنکارانہ نظر رکھتا ہے، پہلا مصنّف عظیم ہے اور دوسرا عظیم تر۔ میرزا کا تعلق اسی دوسری قسم سے ہے۔ اس کے فن میں علامتوں اور اشاروں کا استعمال ضرور ہوا ہے لیکن اس کی تحریر معمّہ کبھی نہیں بنی۔ آسکر وائلڈ کی طرح وہ شیدائے فن بھی ہے اور فدائے حیات بھی۔

میرزا ادیب کے افسانوں میں زندگی کی ہمہ جہتی اور موضوعات کے تنوع کے باوجود ایک قدرِ مشترک موجود ہے جو موضوع ہی کی شکل رکھتی ہے۔ اس موضوع کا تعین "صحرا نورد کے رومان" پر بحث کے دوران کیا جا چکا ہے۔ میرزا کی دور رس نظروں نے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی زندگی میں ظلم کی کئی صورتوں کا مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے۔ زندگی کا حسن اور اس کی مسرتیں اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ لیکن دکھوں محرومیوں اور تہی دامنیوں کے انبوہِ کثیر اور جمِ غفیر میں یہ خوشیاں دبی ہوئی نظر آتی ہیں اور یوں زندگی کا مطالعہ میرزا کی تخلیقات میں المیہ رنگ کے غلبے کا سبب بن جاتا ہے۔ اور دیکھا جائے تو دنیا بھر کے ادب میں عظیم ترین فن پارے وہی ہیں جن میں زندگی کا المیہ پہلو غالب ہے۔ زندگی کی المناک حقیقتیں اتنی ٹھوس ہیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی بھر کی خوشی، زندگی بھر

کا سکون ایک المناک حادثہ ختم کر دیتا ہے لیکن کوئی ایک مسرت انگیز واقعہ زندگی بھر کے غموں کا مداوا کبھی نہیں بن سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی اپنے غم کو سرمایہ حیات سمجھ کر اس ایک واقعے کی یاد دل سے لگائے پھرے۔ زندگی کی ہر شے میں جو فنا ہو جانے کا کردار شامل ہے وہ اکثر واقعات کو الم انگیز بنائے ہوئے ہے۔ ہمیشہ خوش رہنے کے لیے انسان کو یا تو جانور بننا پڑتا ہے یا دیوتا اور ایسا ہر شخص نہیں کر سکتا۔ اکثر لوگ جانوروں کی سی بے حسی کا شکار ہو کر خوش رہتے ہیں۔ یہ بھی بڑا ظلم ہے۔ ان کی بے حسی غموں کے خلاف سپر کا کام کرتی ہے۔ لیکن زندگی دل اور زندہ دماغ بظاہر کتنا بھی خوش نظر آئے زندگی کی المناکی کا قائل ضرور ہوتا ہے۔

میرزا ادیب مسرت سے ناآشنا نہیں ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ زندگی کی المناکی اس کی مسرت انگیزی سے کہیں زیادہ قوی ہے۔ ایسے شخص کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں یا تو وہ دکھوں سے فرار کی تلاش کرتا ہے اور تخیل کی دنیاؤں میں ہمیشہ کے لیے ڈوب جاتا ہے یا پھر دکھوں میں کچھ دیر ڈوبا رہنے کے بعد ابھرتا ہے اور یوں تجربے اور مشاہدے کی قوتوں کی مدد سے دکھوں کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ میرزا نے یہی کیا ہے وہ دکھوں کی دلدل میں پھنس کر نہیں سو گیا بلکہ صاحبِ ہوش فن کار کی طرح اس نے زندگی کے غموں سے لوگوں کو آشنا کرنے کا ارادہ کیا اور انھیں ہر اس ظلم کے خلاف ابھارا جو اس زندگی میں اسے نظر آیا۔ دکھ اس کی زندگی، اس کے تجربے اور اس کے مشاہدے کا اہم ترین حصہ ہیں محرومیوں کو اس نے محض فاصلے سے نہیں دیکھا بلکہ خود محسوس کیا ہے۔ زندگی کی لاتعداد نعمتوں سے محروم ہو کر اس آگ میں جل کر دیکھا ہے۔ معاشرے کے مصائب کا اس نے محل کے جھروکے سے یا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر جائزہ نہیں لیا بلکہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی زندگی کا حصہ بن کر تجربے سے ان کا شعور حاصل کیا ہے۔ میرزا کے جدید افسانوں میں سستی جذباتیت نہیں ہے۔ سستی جذباتیت وہ نقص ہے جس نے "صحرا نورد کے رومان" کی کہانیوں کو عظیم فن پارے اور اے حمید کو عظیم فن کار نہیں بننے دیا۔

میرزا ادیب کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا فن گیرائی اور گہرائی ہر دو خصوصیات کا حامل ہے اور یہی جدید افسانے کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں ایک اور جگہ عرض کر چکا

ہوں کہ سچا اور عظیم فن حصول مسرت، ادب برائے ادب اور ادب برائے حیات کے نظریوں کے قوام سے پیدا ہوتا ہے۔ میرزا کے جدید افسانے اس اصول پر پورے اُترتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو وہ اپنی ذات میں گم ہو کر رہ گیا ہے اور نہ دُکھوں سے فرار کے راستے پر گامزن ہُوا ہے بلکہ ذات، ماحول، معاشرے اور کائنات کی المناک حقیقتوں سے بہرہ ور ہو کر دوسروں کو اپنا ہمنوا بنا رہا ہے۔

میتھیو آرنلڈ نے شکسپیئر کے بارے میں کہا ہے کہ وہ تمام دُکھ جو انسان کی لافانی روح کو برداشت کرنا پڑتے ہیں، انسان کی وہ تمام کمزوریاں جو اس کی تباہی کا سبب بنتی ہیں تمام غم جو اس کی کمرِ ہمت توڑ دیتے ہیں صرف شکسپیئر کی عظیم تحریروں میں نمایاں ہیں۔ ان الفاظ کا اطلاق میرزا ادیب پر بھی ہوتا ہے۔ قارئین کو ہر قسم کی غلط فہمی سے بچانے کے لیے میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں میرزا ادیب اور شکسپیئر کے فن کا مقابلہ نہیں کر رہا بلکہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دونوں کے ہاں زندگی کے براہِ راست تجربے کی فراوانی ہے۔ معاشرے پر خود غرض لوگوں کے قبضے نے اسے ان کے خلاف بغاوت پر اکسایا۔ اعلیٰ قدروں سے لوگوں کی بے تعلقی نے اس کے فن کو تنقیدِ حیات اور خدمتِ حیات کے رجحان دیئے دکھوں اور برائیوں کے اندھیرے میں امید کا دامن اس نے کبھی نہیں چھوڑا۔ گھٹیا کردار کے لوگوں سے بھرے ہوئے معاشرے اور دنیا میں اس نے مائی بھاتاں، دینو اور شتر مرغ کے پہلوان جی ایسے کردار ڈھونڈ نکالے جو سورج کی کرنوں کی طرح تابناک ہیں۔ لیکن ان کی تابناکی کو دیکھنے والی آنکھیں کتنی کم ہیں —— اُسے اس کا غم بھی ہے اور یہ سب باتیں اس حقیقی دنیا کی ہیں۔ ایک کردار، ایک بات بھی ان جدید افسانوں میں ایسی نہیں جو غیر منطقی غیر حقیقی اور ناقابلِ فہم ہو۔ عظیم فن کار کے لیے ان حقائق کا شعور ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ ان کا ایسے انداز سے اظہار بھی ضروری ہے جو جمالیاتی حظ بھی مہیا کر سکے میرزا ادیب فن کار کے ان فرائض سے پوری طرح آگاہ ہے اور عہدہ برآ بھی ہوتا ہے۔

غم زدگی گناہ نہیں ہے لیکن غمزدگی کے بعد ابھرنے اور سنبھلنے کی کوشش نہ کرنا گناہ ہے۔ یہ سوچ کر کہ دُکھوں کا سمندر بے کراں ہے جو ہماری کشتیٔ امید کو پاش پاش کرنے کی قوت رکھتا

ہے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا میرزا کے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔ اس کی تمام تخلیقات میں اس رجحان سے صاف دشمنی نظر آتی ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ جب تک بغاوت نہ کی جائے گی ظلم کی اقدار متزلزل نہیں ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں ہر طرف محرومی کے شدید احساس کے ساتھ ساتھ میرزا کے ہاں رجائیت کی وہ لہر رواں دواں نظر آتی ہے جو غموں کی فراوانی میں انسان کو نہ صرف زندہ رکھتی ہے بلکہ اسے عظیم تر مقاصد بھی عطا کرتی ہے اور ان مقاصد کے حصول کی قوت بھی دیتی ہے۔ یہ رجحان یا خیال میرزا نے خود پر طاری نہیں کیا بلکہ تجربے نے اسے دیا ہے۔ یہ حقائق ہمیں میرزا کی ذات اور اس کے فن کی ایک اور خصوصیت سے بھی متعارف کراتے ہیں اور وہ ہے تجربے کی صداقت اور خلوصِ اظہار۔ خلوص کا لفظ اپنے عام معنوں میں بہت بدنام ہو چکا ہے لیکن تجربے اور مشاہدے کو مصلحت کوشی اور تعصب کے جراثیم سے بچا کر فن کے سانچوں میں ڈھالنے کو اس سے بہتر نام نہیں دیا جا سکتا یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بعض ادیب اپنی تخلیقات کو یہ کہہ کر گورکھ دھندا بنا دیتے ہیں کہ ان کا تجربہ ہی بڑا پیچیدہ ہے۔ اس سے زیادہ احمقانہ بات ادیب کی زبان سے نہیں نکل سکتی۔ ادیب عام آدمی سے بڑا محض اس لیے ہے کہ جہاں اس کے ہاں جذبے کی شدت اور خیالات، علامات، مطالعہ اور مشاہدے کی فراوانی ہے وہاں وہ اس قابل بھی ہے کہ ذہن پر مرتسم ہونے والی تصویروں کو ایسے پیرائے میں بیان بھی کر سکے کہ قاری تک اس کا ابلاغ آسانی سے ہو جائے۔ پہیلیوں میں بات کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگ تحریر میں مختلف معنے تلاش کرنے لگتے ہیں اور یوں ایک قسم کی مصنوعی پیچیدگی اور ذو معنویت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جو مصنف اپنے تجربے اور مشاہدے کو اور ذہن پر مرتسم ہونے والے نقوش کو اپنی قوتِ تخلیق، شعور اور ادراک کی مدد سے ایک واضح صورت میں پیش نہیں کر سکتا اسے ابھی مزید ریاض کی ضرورت ہے۔ اگر فن کار شعور سے کام لینا پسند نہیں کرتا اور لاشعور کے دائروں میں ہی گھرا رہتا ہے تو سمجھ لیجئے ابھی وہ حیوانی سطح سے آگے نہیں بڑھا اور ابھی اسے ارتقا کی کئی اور منازل طے کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ انسانی سطح پر کھڑا ہو سکے۔

اس بحث سے جہاں اچھے ادب کی چند خصوصیات کا ذکر مقصود تھا وہاں اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کرنا بھی پیش نظر تھا کہ میرزا کے فن میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ میرزا نے عظیم فن کے تقاضوں کو اپنے جدید افسانوں میں بطریق احسن پورا کیا ہے۔ زندگی پر اس کی نظر بہت گہری ہے وہ نہ صرف محرکات کا تجزیہ کر سکتا ہے بلکہ مختلف محرکات اور واقعات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف انسانوں کے ایک دوسرے پر وارد ہونے والے اثرات کی نوعیت گوناگونی اور وحدت سے بھی آگاہ ہے۔ وہ ان سب کے باہمی رشتوں کو سمجھتا ہے اور اشیاء اور واقعات کے اشارے جن حقائق کی نمائندگی کرتے ہیں ان تک بآسانی پہنچ جاتا ہے پھر میرزا کا فن کسی ایک منزل کا اسیر ہو کر نہیں بیٹھ گیا۔ اس کے قلم کو کبھی سستانے کی اجازت نہیں ملی۔ ییٹس Yeats کی طرح وہ ہمیشہ لکھتا رہے گا۔ فراق گورکھپوری کی طرح اس کے فن میں کسی قسم کا زوال نہیں آیا۔ اس کے بہت سے افسانے چیخوف ایسے عظیم فن کاروں کی صف میں جگہ پاتے ہیں۔ وہ چیخوف سے کم صرف اس لحاظ سے ہے کہ چیخوف کے مقابلے پر اس کی تخلیقات کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ جہاں تک معیار کا تعلق ہے میرزا کے افسانے چیخوف کے افسانوں کا معیار رکھتے ہیں۔

جدید افسانوں میں میرزا کے موضوعات کی نشاندہی ڈاکٹر عبادت بریلوی نے "جنگل" کے پیش لفظ میں بڑی خوبی اور وضاحت سے کی ہے اور مجھے ان کی آراء سے پورا اتفاق ہے۔ معاشرے کے ناسور اور زندگی کی محرومیاں اس کے محبوب موضوع ہیں۔ محرومی کا تعلق صرف مالی طور پر غریب لوگوں سے نہیں ہے بلکہ مختلف صورتوں میں محرومی کا دکھ ہر طبقۂ اناس میں رواں دواں ہے۔ میرزا نے زندگی کو بلاواسطہ بھی دیکھا ہے اور اپنی ذات کے وسیلے سے بھی اس کا مطالعہ کیا ہے اور یوں وہ زندگی کی گہرائیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہو گیا ہے "صحرانورد کے رومان" اور "دنیائے آرزو" میں موضوع اور فن کی جو ہم آہنگی موضوع سے شدید طور پر متاثر ہونے کی وجہ سے مجروح ہو گئی تھی وہ اس کے جدید افسانوں میں مکمل طور پر موجود ہے۔ فنی توازن پر اب اس کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ اس کے پھر متزلزل ہونے کا اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میرزا کے افسانوں کے

دو مجموعے "لاوا" اور "دیواریں" اب نایاب ہیں لیکن ان کے منتخب افسانے "کمبل" میں شامل ہیں. میں نے ان افسانوں میں سے "گونگی محبت" اور "ان داتا" منتخب کئے ہیں. میری بہت خواہش تھی کہ "دیا" بھی اس مجموعے میں شامل ہو لیکن ضخامت بڑھ جانے کا خوف سدراہ رہا "دیا" آسکر وائلڈ کے افسانے "خوش باش شہزادہ" The Happy Prince کی نہ صرف یاد دلاتا ہے بلکہ اسی سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے. "ان داتا" کا موضوع غلام عباس کے "آنندی" سے مختلف ہے لیکن یہ دونوں افسانے ایک ہی طرح کی عظمت کے حامل ہیں. "آنندی" ان افسانوں میں سے ہے جو جذباتیت سے بچ کر لکھے جاتے ہیں اور جو مصنف کی عظمت اور شہرت پر دال ہوتے ہیں. "ان داتا" بھی اسی قسم کا افسانہ ہے. ان دونوں افسانوں میں مصنفین کا انداز فکر ایک رنگ کا حامل ہے. اس مجموعے کے بعد کے افسانوں میں سے "مائی بھاتاں" "کمبل" اور "دینو" اس مجموعے میں شامل ہیں. میں نے ترتیب میں ان افسانوں کو سب سے آخر میں اس لیے رکھا ہے کہ اندازاً افسانے تخلیقی ادوار کی ترتیب سے سامنے آئیں. مجھے سب سے زیادہ پریشانی "جنگل" میں سے انتخاب کے وقت پیش آئی. کیونکہ ہر افسانہ میرا راستہ روکے کھڑا تھا. کہ جا اینجا است. چنانچہ میں نے موضوعات کا تنوع قائم رکھنے کی کوشش کی تو بمشکل کسی فیصلے پر پہنچ سکا. "ایک دکان" موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے اور یہ اس مجموعے میں شامل ہے. "۲۷ سال بعد" "مرکز" اور "آزادی" کے موضوع بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں. میں نے ان میں سے "آزادی" کا انتخاب کیا ہے. "شتر مرغ" ایسا اعلیٰ افسانہ ہے جس میں میرزا کردار نگاری کی ایک اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے اس مجموعے میں ضرور شامل ہوتا اگر میں ایسے ہی تین افسانوں "مائی بھاتاں" "کمبل" اور "دینو" کا انتخاب نہ کر چکا ہوتا. "درونِ تیرگی" میرزا کے چند علامتی افسانوں کی نمائندگی کرتا ہے. "ایک مصنف" اور "آرمینیہ کا ہیرو" کا موضوع ایک ہی ہے. میں نے اس مجموعے میں "ایک مصنف" کو شامل کیا ہے کہ یہ ایک حد تک میرزا کی ذات کا عکس بھی اپنے اندر رکھتا ہے.

میں یہاں ہر افسانے پر الگ الگ بحث کا ارادہ نہیں رکھتا لیکن ان افسانوں کی چند خصوصیات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں ــــــ محبت کے موضوع پر میرزا نے بہت

کم جدید افسانے لکھے ہیں۔ اس مجموعے میں صرف "گونگی محبت" شامل ہے۔ دوسرا افسانہ جو اس افسانے کا ہر لحاظ سے ہم پلہ ہے "بدصومیاں" ہے۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا اسلیحت اور جذباتیت کا قائل نہیں۔ عشق اگر خود پر ڈسپلن کی کوئی پابندی، ضبط کی کوئی قدغن نہ لگائے تو اس کا گھر پاگل خانہ ہے۔ میرزا کے نزدیک محبت ایک فطری جذبہ ہے جس کی تسکین ضروری ہے۔ محبت اور جنس کا تعلق ازلی و ابدی ہے۔ محبت جہاں کئی پیچ در پیچ ذہنی کیفیات اور غیر مرئی تعلقات و احساسات کا اظہار ہے وہاں یہ جنس کی تسکین کا ذریعہ اور جنسی خواہشات کا اظہار بھی ہے۔ جنسی محبت انسان کا جبلّی تقاضا ہے جسے صرف موت ہی ختم کر سکتی ہے۔ زبان، ہاتھ، ناک، آنکھ جسم کے کسی بھی عضو کی خرابی یا کمی اس جذبے کو موت کی نیند نہیں سلا سکتی، صرف عارضی طور پر دبا سکتی ہے لیکن دب کر یہ جذبہ شدید تر ہو جاتا ہے اور پھر آتش فشاں کی طرح پھوٹ نکلتا ہے۔ جس کے سامنے اس جذبے کے مالک کو عالم بے اختیاری میں سپر انداز ہونا ہی پڑتا ہے۔ "گونگی محبت" اور "بدصومیاں" اسی نظریے کی تشہیر کرتے ہیں۔ "گونگی کے پاس قوتِ گویائی نہیں ہے اور بدصومیاں بڑی حد تک عقل سے محروم ہیں۔ اور "باجی" کے چہرے کو چیچک نے داغدار اور بدنما کر دیا ہے لیکن یہ تینوں کردار محبت کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جو عظیم المیے کو جنم دیتی ہے۔ یہ وہ محرومی ہے جو امیر غریب کا فرق روا نہیں رکھتی ہے اور جس کی نظر میں آقا اور غلام سب برابر ہیں۔

گونگی دیپک پر قربان ہو جاتی ہے اور دیپک بھی مر جاتا ہے۔ اس واقعے سے ہمارے منتقمانہ جذبات کو یہ اطمینان ضرور حاصل ہوتا ہے کہ گونگی نے غیر ارادی طور پر فطرت سے اس ظلم کا بدلہ لیا ہے جو اس نے اس کی قوتِ گویائی چھین کر دیا تھا لیکن فطرت ہی کی طرف سے ہونے والے اس ظلم کا کیا علاج ہے جو اس نے ابتدا سے اس کا خاوند دیپک چھین کر کیا۔ فطرت نے گونگی سے قوتِ گویائی چھینی تھی لیکن اس کے جنسی تقاضے تو نہ بدلے جا سکتے تھے۔ اسی طرح بدصومیاں اگر کم عقل ہیں اور باجی کا چہرہ بدنما ہے تو اس میں بھی فطرت کا قصور ہے۔ فطرت کی جانب سے بظاہر روا رکھے جانے والے ظلم کا احساس یوں میرزا کے فن کا ایک موضوع بن جاتا ہے پھر یہ حقیقت کہ ہر عیب دار شخص کے دل میں محبت کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا ہے اس ظلم کے احساس کو شدید بھی کرتا ہے۔

اور کم بھی۔ شدید اس صورت میں کہ گونگی کی طرح ایسا شخص تڑپ تڑپ کر مر جائے اور کم اس صورت میں کہ بدھو میاں اور باجی ایسے لوگ آپس میں محبت کر کے زندگی کی تلخیوں کو بھول کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے زندگی گزار دیں،———— فطرت کی طرف سے بظاہر روا رکھے جانے والے ظلم کے خلاف میرزا نے شکایت ضرور کی ہے لیکن اس نے وہ ناپختہ اور غیر متوازن رویّہ اختیار نہیں کیا جو ن۔م راشد۔ بائرن اور شیلے نے اختیار کیا تھا اور جس پر یہ تینوں شاعر خود بھی مستقلاً عمل پیرا نہ رہ سکے تھے۔ راشد خدا کا باغی تھا مگر اب یہ بغاوت سرد ہو چکی ہے۔ بائرن آخری عمر میں اپنے کردار اور اعمال پر پشیمان ہو کر مرا اور شیلے نے ایک بے انصاف خدا کو رد کر کے جس نئے خدا کی تخلیق کی کوشش کی وہ اس کے کسی کام نہ آ سکا۔ شیلے اور بائرن پر یہ دورہ کم عمری اور ناپختگی کے زمانہ میں پڑا۔ شاید یہی صورت راشد کے ساتھ بھی رہی ہو۔ میرزا پر یہ دور نہیں آیا بغاوت کو میرزا نے تقدس کا درجہ دیا ہے، یہ جہاد کا دوسرا نام ہے لیکن خدا اور اس کی بے انصافیوں کے سلسلہ میں میرزا نے خود کو کبھی بے نتیجہ اور تکلیف دہ کش مکش کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اُس نے وہ نتیجہ شروع ہی میں اخذ کر لیا تھا جس پر دوسرے بہت دیر سے پہنچ سکے۔ اور پھر میرزا یہ بھی جانتا ہے کہ اگر فطرت نے بدھو میاں اور باجی کو بعض نعمتوں سے محروم رکھا ہے تو ان کے دل میں وہ محبت بھی تو پیدا کر دی ہے جو ان کی محرومی کا علاج بن جاتی ہے اور گونگی بے زبان ہے تو دیپک کے ساتھ ختم ہو کر وہ لافانی بھی تو ہو جاتی ہے۔ گویا میرزا جہاں فطرت کے ظلم کا شاکی ہے وہاں اس کی عنایات کا شکر گذار بھی ہے۔

میرزا کا سب سے بڑا موضوع وہ انسانی معاشرہ ہے جس کے لاتعداد دعووں کے باوجود ان گنت افراد زندگی کی خوشیوں سے محروم ہیں۔ وہ معاشرہ جو اعلیٰ کردار کی شخصیتوں کو محرومی کی آگ میں جلاتا ہے اور احمقوں کو مسند ہائے توقیر و عزت پر بٹھا کر پوجتا ہے جو اپنے وقت کے عظیم زندہ انسانوں کو تعریف تو دے سکتا ہے لیکن ان کا پیٹ نہیں بھر سکتا اور انھیں بھوکوں مار ڈالتا ہے۔ لوگ آرمینیہ کے ہیرو شہاب کی پرستش کرتے ہیں۔ شہر میں اس کا بت نصب کیا گیا ہے، وہ قوم کا ہیرو ہے لیکن قوم اس کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتی ایک مصنف چند دن مہمان کی حیثیت سے ہر طرح کا آرام حاصل کرتا ہے لیکن جلد ہی بھوکا مرنے

لگتا ہے۔ شہرت اور تعریف پیٹ تو نہیں بھر سکتیں۔ "سینتیس سال بعد"، "مرکز" اور "آزادی" معاشرے کے غریب اور مفلوک الحال لوگوں کی محرومیوں، پریشانیوں اور مجبوریوں کی کہانیاں ہیں۔ معاشرہ کیسے شریف آدمی کو مجرم بنا ڈالتا ہے "سینتیس سال بعد" اس سوال کا جواب ہے معاشرہ کا ظلم کس طرح انسان کی عزتِ نفس کو ختم کر دیتا ہے۔ "مرکز" اور "آزادی" اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔ یہ موضوع میرزا ادیب کے علاوہ فن کارانہ چابک دستی سے صرف شوکت صدیقی نے پیش کئے ہیں۔

"کمبل" اور "جنگل" کے افسانوں میں میرزا کا اسلوب جذباتیت سے پاک ہے۔ اسی لیے وہ اے حمید سے بہت بلند ہے۔ وہ حقیقت پسند طبیعت کا مالک ہے اور الفاظ کو خیالات کے طابع رکھتا ہے۔ ان افسانوں میں اس کا اظہار وانکشاف انداز اختیار نہیں کرتا۔ ان میں ایک معلّم ضرور چھپا ہوا ہے لیکن میرزا کا فن وہ اخلاقی کہانیوں والا فن نہیں جہاں فن ختم ہو جاتا ہے یہ اعتراض صرف "صحرا نورد کے رومان" اور "دنیائے آرزو" پر ہی وارد ہوتا ہے اپنے جدید افسانوں میں میرزا کہیں بھی سیدھا سادا واعظ یا مصلح یا معلّم بن کر سامنے نہیں آتا بلکہ ایک چابکدست فن کار کی طرح اپنا پیغام موضوع اور فن کی ہم آہنگی اور توازن کے تمام تقاضے پورے کر دیتا ہے۔ وہ معلّم ضرور ہے لیکن زندگی کی اعلیٰ کائناتی اقدار کا۔ میرزا کے افسانوں میں ایک اور فنی خوبی موجود ہے جو ہمارے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں خال خال ہی نظر آتی ہے یہ خوبی وہ DETACHMENT ہے جو شیکسپیئر کا طرۂ امتیاز ہے اور بعض بڑے فن کاروں میں شیکسپیئر سے قدرے مختلف انداز میں ملتی ہے۔ ایڈمنڈ ولسن کے قول کے مطابق گلیور کے سفر ناموں میں فن کار نظروں سے اوجھل رہتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک یہ بد ذوقی ہوگی کہ وہ اپنے ہیرو کو اپنی ذات سے ہم آہنگ کرے یا اپنے ہیرو کے کارناموں کو اپنا بنا کر پیش کرے یا قاری اور قصے کے درمیان مخل ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرے۔[۱] یہی وہ DETACHMENT ہے جس کی جانب میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ شیکسپیئر کے ہاں یہ خوبی دوسرے تمام مصنفین سے

---

[۱] واوین میں ترجمہ ضمیر الدین احمد کا کیا ہوا ہے۔

زیادہ نمایاں ہے۔ اگر فن کار صرف اپنی ذات ہی میں الجھ کر رہ جائے تو کرداروں کا وہ تنوع، اور زندگی کی وہ رنگارنگی جو شیکسپیئر کے ہاں موجود ہے ناممکن الحصول شے ہو جائے۔ سوفٹ اور جارج برنارڈ شا کے ہاں اپنی اپنی جگہ یہ خصوصیت موجود ہے۔ لیکن اس کا احساس جس شدت سے شیکسپیئر کے ہاں ہوتا ہے کسی اور فن کار کے فن میں نہیں ہوتا۔ مثلاً گلیور کے سفرنامے میں ہی سوفٹ اپنے تعصبات کو دبانے میں کامیاب نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے تعصبات ہی اس کتاب کی تخلیق کا سبب بنے ہیں۔ شا کے ڈرامے اینڈ روکلیز اور شیر میں مصنف دورانِ تمثیل ایک لحاظ سے بظاہر الگ بیٹھا نظر آتا ہے لیکن ڈرامے کے اختتامیے اور پیش لفظ اور شا کے عام اسلوب اور اس کی دیگر کتب کے مطالعے سے پتہ چل جاتا ہے کہ ڈرامے میں شروع سے آخیر تک ایک لحاظ سے سوائے شا کی اپنی ذات کے کچھ نہ تھا۔ اس کو اپنے نظریات سے جذباتی لگاؤ ہے جس کا اظہار ہو جاتا ہے لیکن شا ایک عظیم فن کار تھا اور وہ دورانِ تمثیل قاری کو یہ احساس دلانے میں بڑی حد تک کامیاب ہے کہ اس نے اپنی ذات کو ڈرامے میں کسی طرح بھی مخل نہیں ہونے دیا۔ مخل ہونے کی صورت صرف یہ نہیں کہ مصنف کرداروں کی بجائے کہانی میں ایک خود مختار مبصّر کی حیثیت سے داخل ہو کر اپنے تاثرات پیش کرنے لگے بلکہ یہ بھی ہے کہ اپنے تعصبات پسند اور ناپسند کو کہانی میں ایک خاص رنگ بھرنے کی اجازت دے دے۔ پہلی صورت ایک بہت بڑا فنی نقص ہے لیکن دوسری صورت ایسی ہے کہ اس سے گریز ناممکن ہے جو معروضیت اور داخلی اور خارجی حقائق کی سمجھ بوجھ شیکسپیئر کے ہاں ملتی ہے۔ وہ تو کہیں اور نظر نہیں آتی اپنے نظریات کا پرچار بھی تو ایک حد تک مخل ہونے کے مترادف ہے۔ شیکسپیئر تو اس سے بھی بچ کر چلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بھی تردامنی سے بچ نہیں سکا کہ فنکار کی شخصیت کو اس کی تخلیق سے مکمل طور پر جدا رکھنا ناممکن ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر اس نے اسلام کے خلاف چند تعصباتی اشارے کئے ہیں۔ گویا ایڈمنڈ ولسن کی بات بھی مشروط طور پر ہی تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ادب میں نظریات کی ترویج و تشریح کو عیب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر فن کار موضوع اور فن کی مکمل ہم آہنگی قائم کرنے میں کامیاب ہے۔ تو خواہ وہ شیکسپیئر والی عظمت نہ بھی حاصل کر سکے ہماری نظروں میں وہ عظیم ہے۔ کیونکہ کسی بھی مصنف کے لیے یہ ممکن نہیں

کہ وہ معروضی انداز پر سوچے اور اپنی ذات اور تعصبات کو اپنی تخلیق سے بالکل جدا رکھے۔ ڈراما، تاریخ اور بڑی حد تک افسانے میں اس رجحان کی بہت ضرورت اور اہمیت ہوتی ہے کیونکہ وہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور کرداروں کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی مقصود ہوتی ہے۔ لیکن ادبی فن پارے میں خواہ وہ ڈراما ہو یا افسانہ مصنف کی ذات اور اس کے تعصبات کلی طور پر اس کی تخلیق سے الگ نہیں رہ سکتے۔ کسی نہ کسی حد تک مصنف کی ذات کا پرتو اس کی تخلیق میں ضرور ملے گا۔ شیکسپیئر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ سوفٹ اور شا اور چیخوف اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کی DETACHMENT اشیاء پر معروضی نظر شیکسپیئر سے مختلف اس لیے ہے کہ شیکسپیئر کے ہاں اس انداز سے نظریات کی ترویج اور پسند و ناپسند کا اظہار نہیں ہوتا جیسے ان مصنفین کے ہاں ہوتا ہے۔ ہم اس DETACHMENT کو مصنوعی کہہ سکتے ہیں۔ اب میں واضح طور پر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ گو میں نے اس DETACHMENT کو مصنوعی کہا ہے یہ میری نظر میں فن پارے کا نقص ہرگز نہیں ہے بلکہ خوبی ہے کیونکہ شیکسپیئر والی DETACHMENT ہزاروں سال بعد ہی کسی ایک آدھ شخص کو میسر آتی ہے۔ ہمارے ہاں بڑی حد تک سعادت حسین منٹو میں یہ بات ضرور تھی۔ ناول نگاروں میں ایک حد تک عزیز احمد کے ہاں اس کا احساس ہوتا ہے۔ وہ مصنفین جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے اپنے نظریات کی ترویج، تشہیر اور تعصبات کے اظہار کے باوجود قاری کو یہ احساس دلانے میں کامیاب ہیں کہ وہ معروضی طور پر سوچ رہے ہیں خواہ انھیں اپنے موضوع سے کتنا بھی جذباتی لگاؤ کیوں نہ ہو۔ یہ جذباتی تعلق فن پارے کے الگ مطالعے کے دوران ظاہر نہ بھی ہو تو فنکار کی شخصیت اور اس کی دوسری تخلیقات کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے۔ میرزا ادیب کے جدید افسانوں میں ہمیں یہی دوسری قسم کی یعنی مصنوعی DETACHMENT ملتی ہے۔ زندگی کے بارے میں میرزا کے واضح نظریات ہیں۔ فن کے بارے میں بھی اس کے ذہن میں کسی قسم کی لاینحل پیچیدگی نہیں ہے۔ لیکن وہ ان افسانوں میں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہونے دیتا کہ وہ جذباتی ہے اور کوئی نظریہ ہم پر ٹھونسنا چاہتا ہے اور یہ ایسے فن کار کی جو زندگی میں نظریات کی روشنی میں راستہ دیکھنے کا

قائل ہے کامیابی کی بہت بڑی دلیل ہے ۔ میرزا نے تجربات و مشاہدات سے جو کچھ سیکھا ہے۔ وہ چند نظریات کی شکل میں اس کے افسانوں میں بکھرا پڑا ہے ۔ یوں تو یہ نظریات "صحرا نورد کے رومان" اور "دنیائے آرزو" میں بھی موجود ہیں لیکن جدید افسانوں میں موضوع اور فن کی ہم آہنگی نے میرزا کے افسانوں کو فنی لحاظ سے بہت اونچا مقام دیا ہے ۔ جبکہ متذکرہ بالا دونوں کتابوں میں یہ نظریات سیدھے غیر فن کارانہ طریق پر جمع کر دیئے گئے ہیں ۔ "جنگل" اور "کمبل" دونوں مجموعوں میں میرزا چیخوف کے ساتھ فن کی انتہائی بلندیوں پر کھڑا مسکرا رہا ہے ۔ اس نے خود کو موضوع کی ذات میں گم کر کے اُبھارا ہے اور یوں موضوعیت اور معروضیت کے ایک خوش آیند ادغام کی صورت پیدا ہو گئی ہے ۔ شاعری میں موضوعیت کو نہ صرف بہت بڑی خوبی بلکہ ایک لازمہ سمجھا جاتا ہے لیکن افسانہ نگار کے ہاں اگر یہ رجحان ایک دو افسانوں سے آگے بڑھ جائے تو بہت بڑا نقص بن جاتا ہے کیونکہ یہ جذباتیت پیدا کرتا ہے ۔ اے حمید اسی نقص کا شکار ہے اور شوکت تھانوی اور وہ تمام مصنفین جنھوں نے اسلامی واقعات کو ناول کی شکل دی ہے اے حمید سے بھی کہیں نچلی سطح پر جذباتیت کے مارے پڑے ہیں ۔ میرزا ادیب کے جدید افسانوں میں یہ نقص نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی ، کرشن چندر ، بیدی عصمت اور شوکت صدیقی وغیرہ کے ہاں بھی یہ خوبی پائی جاتی ہے ۔ ندیم کے شروع کے افسانے ضرور ایک حد تک رومانی جذباتیت کے حامل ہیں لیکن اب ان کے افسانوں کا انداز بدلا ہوا ہے کرشن چندر میں بہت رومانیت ہے لیکن ان میں حقیقت پسندی بھی اتنی ہی زیادہ ہے ۔ اس لیے ایک توازن سا اس کے ہاں پیدا ہو گیا ہے ۔ وقار عظیم نے میرزا ادیب پر جس کھوکھلی رومانیت کا الزام لگایا تھا اس کا اطلاق "کمبل" اور "جنگل" کے مجموعوں پر کسی طرح بھی نہیں ہوتا ۔ یقیناً یہ رائے ان کتابوں کے مطالعے کے بغیر دی گئی تھی ۔ جنوری ۱۹۵۴ء کے "نقوش" کے افسانہ نمبر میں جو سمپوزیم چھپا ہے وقار عظیم نے میرزا کے بارے میں یہ رائے اس میں دی ہے ۔ اس وقت تک میرزا کے بہترین افسانوں کا مجموعہ "جنگل" منظر عام پر آ چکا تھا اور "کمبل" کے کئی افسانے اس سے بھی پہلے چھپ چکے تھے ۔ ان حالات میں وقار عظیم کا میرزا کے بارے میں یہ نظریہ انتہائی غیر منصفانہ ہو جاتا ہے کہ وقار عظیم نے بعد کی ان کہانیوں پر کوئی توجہ دیئے بغیر اپنا فیصلہ صادر کر دیا ۔

(۳)

ہر نئے مصنف کا روایت سے رابطہ اپنے پیشروں اور ہم عصروں کی تخلیقات کے مطالعے سے قائم ہوتا ہے اور اس کی تحریر میں بعض خصائص اور رجحانات بالخصوص ابتدائی تحریروں میں براہِ راست اس مطالعے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مصنف کے حق میں یہ بہتر ہوتا ہے کہ روایت سے پوری طرح واقف ہونے اور اس کے اچھے اثرات قبول کرنے کے بعد اپنا انفرادی راستہ تلاش کرے ورنہ محض کسی ایک روایت یا فن کار کی تقلید اس کی انفرادی خوبیوں پر پردہ ڈال کر اس کی اہمیت کو نمایاں ہونے سے روک دے گی۔ صرف ایک صورت میں یہ رجحان قابلِ قدر ہو سکتا ہے اور وہ یوں کہ نیا فن کار اپنے پیشروؤں سے آگے نکل جائے۔ ایسا ذرا کم ہی ہوتا ہے اور پھر مختلف فن کاروں میں موضوع اور اسلوب کی یکسانیت قاری کے لیے تھکن اور بیزاری کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر آپ صرف غالبؔ کے رنگ میں لکھ سکتے ہیں تو آپ کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ یا تو اس سے آگے نکل جائیے یا کوئی نیا پیرایۂ اظہار اختیار کیجیے۔ اقبالؔ کی تقلید میں لکھنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے لیکن ان میں سے اقبالؔ کی عظمت کی وجہ سے کوئی بھی زندہ رہنے اور یاد رکھے جانے کے قابل نہیں ہے۔ میرؔ کے مداح میرؔ کے مقلدوں کی بجائے میرؔ ہی کا مطالعہ کیوں نہ کریں۔ لیکن جو شاعر میرؔ کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ کچھ اپنا انفرادی رنگ بھی اپنے شعروں میں بھرتا ہے وہ یقیناً کامیاب ہے۔ ناصر کاظمی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ تقلیدِ محض، کی مثال شفقتؔ کاظمی ہے۔ شفقت کو حسرتؔ سے عشق ہے۔ وہ خود کو خاکِ پائے حسرت کہتا ہے اور اس کے پہلے مجموعہ کلام کا نام حسرت کدہ ہے۔ اس کا المیہ یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے بہترین تخلیقی سال اور قوتیں محض حسرتؔ کی تقلید میں ضائع کر دیں ادھر چند برس سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ ان کی شاعری میں کوئی نیا راستہ تلاش کرنے کی کمزور سی خواہش کروٹ لے رہی ہے۔ معلوم نہیں شفقت کاظمی کو اس کا احساس ہے کہ نہیں۔ شفقت ذہین ہے لیکن اس نے اپنی ذہنی و تخلیقی قوتوں کو محض تقلید کی نذر کر کے اُردو پر ظلم کیا ہے۔ وہ حسرتؔ کو مرشدِ کامل مانتا ہے۔ یہ اس کی پسند کا معاملہ ہے ورنہ میرے نزدیک حسرتؔ کی شاعری میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی تقلید کی جائے۔

مرید مرشدِ کامل میں اپنی ذات کو مدغم کر دینا ہی اپنی معراج سمجھتا ہے۔ لیکن ادب میں اس جذبے کو انفرادیت کی موت کہا جائے گا اور انفرادیت وہ شے ہے جس کے بغیر فنکار چشمۂ آبِ حیات کا سراغ نہیں پا سکتا۔

مجھے جہاں ناصر کاظمی کی تقلیدِ میر کے باوجود اپنی انفرادیت کو مجروح نہ ہونے دینے کی ادا پسند آئی ہے وہاں شفقت کاظمی کی تخلیقی قوتوں کے ضیاع کا بے حد صدمہ ہے ——— میرزا ادیب بھی اگر "صحرانورد کے رومان" والا انداز مستقلاً اختیار کئے رکھتا تو آج ادب میں اُسے کوئی بلند مقام نہ مل سکتا۔ صحرانورد کے پانچ رومان پڑھ کر ہی طبیعت اس لیے تھک جاتی ہے کہ ان میں یکسانیت کا زہر پھیلا ہوا ہے۔ "صحرانورد کے خطوط" کے فوراً بعد میرزا جذبے کی شدت اور اصلاح کے جوش کی فراوانی کے زیرِ اثر فنی طور پر غلط راہ پر گامزن ہو گیا تھا لیکن وہ بہت جلد سنبھل گیا اور روایت سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے اس نے اپنا نیا اور صحیح راستہ ڈھونڈ نکالا۔ چنانچہ اس کے جدید افسانوں کے موضوعات میں گو ایک قدرِ مشترک موجود ہے تاہم زندگی کی رنگارنگی اور تنوع کا شدید احساس ضرور ہوتا ہے۔ اس نے "ایک دوکان" اور "درونِ نیرگی" ایسے افسانے بھی لکھے جو افسانے کی عام روش سے بالکل ہٹ کر ہیں اور نئی روایت کا مکمل ساتھ بھی دیا اور اسے آگے بھی بڑھایا۔ وہ جہاں روایت سے قطع تعلق کا قائل نہیں ہے وہاں وہ تقلیدِ محض کو بھی مکمل طور پر رد کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی داستانوں اور رومانوں میں بھی ایک خاص قسم کی اُپج موجود ہے۔ اور وہ کہانیاں محض روایتی نہیں ہیں۔ نئے اسلوب، نئے آہنگ کی یہ تلاش برابر جاری ہے۔ اسی لیے اب وہ ڈرامے لکھ رہا ہے۔ وہ روشنی پھیلانا چاہتا ہے وہ چراغ گل کر دینے کے حق میں نہیں ہے۔ بلکہ اسے برقی قمقمے کی سی قوت دینے کا آرزومند ہے کہ یہ روایت نہیں بلکہ اس کی حیات لَو ہے۔

کسی مصنف پر وارد ہونے والے اثرات کا تعین کرتے وقت بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ ہم نے بعض مصنفین کے وہ خصائص جو ان کے اپنے تھے ان مصنفوں سے منسوب کر دیئے ہیں جنھوں نے انھیں کبھی متاثر نہیں کیا ہوتا۔ چراغ سے چراغ ضرور جلتا ہے لیکن بعض چراغ خود مختارانہ حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں

کہ نئے مصنف کی ہر خوبی کا سرچشمہ کسی پیشرو یا ہم عصر میں تلاش کیا جائے۔ فن کار خود بھی کئی ذاتی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے جن کے لیے وہ کسی کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ فن کار پر اس کے مطالعے کا اثر ضرور ہوتا ہے، یوں ہم میرزا پر وارد ہونے والے اثرات کی بھی ایک حد تک نشاندہی کر سکتے ہیں۔ صحرانورد کے خطوط اور رومان میں سجاد حیدر یلدرم کی رومانیت اور حجاب امتیاز علی کے افسانوں کی فضا کی پُراسراریت و خوف انگیزی کا اثر نظر آتا ہے۔ لیکن میں ان خصائص کو یلدرم اور حجاب تک محدود نہیں دیکھتا۔ بالخصوص حجاب کی شخصیت اور فن میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے کوئی پختہ فکر فنکار کوئی مستقل اثر لے سکے۔ میرزا نے حجاب کا مطالعہ اوائل عمر میں کیا۔ اس عمر میں خوف اور اسرار کی کہانیاں بڑھتے ہوئے ذہن کے لیے بہت سامانِ کشش اپنے اندر رکھتی ہیں۔ محض اس وجہ سے میرزا بھی تھوڑا متاثر ہوا۔ لیکن یہ اثر بہت جلد زائل ہو گیا۔ میرزا کی داستانوں میں جو تحیر اور اسرار کی فضا ہے اس کا اصل سرچشمہ اردو کا داستانی ادب ہے جس کا میرزا نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ حجاب سے میرزا کو سوائے اس تحریک کے کہ آج بھی ایسی چیزیں لکھی جاتی ہیں کچھ نہیں ملا۔ سب سے بڑی چیز وہ سماجی شعور ہے جس سے صحرانورد کے چند خطوط کے علاوہ اس کا کوئی بھی فن پارہ عاری نہیں اور جس کا حجاب کے ہاں گذر بھی نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں میرزا کی فنی ترقی اور اسلوب میں بھی حجاب کا نہ کوئی حصہ ہے اور نہ دیرپا اثر۔ اگر حجاب ایڈگر ایلن پو کی طرح ہوتی تو یقیناً دوسروں کو متاثر کرتی۔

ابتدائی دور میں میرزا چند مغربی مصنفین سے بھی متاثر نظر آتا ہے۔ رائیڈر ہیگرڈ، فرانسیسی مصنف گاتیئر اور واشنگٹن ارونگ کے اثرات نمایاں ہیں۔ صحرانورد کے خطوط اور رومان کی فضا میں ان سب کا اثر موجود ہے اور بعض اثرات کا تعین تو پورے یقین کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً "ملکہ مصر" کا ماخذ رائیڈر ہیگرڈ ہے اور "مورتی" کا گاتیئر۔ ارونگ کا اثر زیادہ تر عمومی نوعیت کا ہے۔ ان تینوں مصنفوں کی تخلیقات بھی اس نوع سے تعلق رکھتی ہیں جو عنفوانِ شباب میں آدمی کے تخیل کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ ان کہانیوں میں کشش کے ظاہری سامان بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں اور نوجوانوں کا ان سے متاثر ہو جانا حیرانی کی بات نہیں۔ اس عمر میں داستانوں اور اساطیر میں پنہاں ابدی صداقتوں کا شعور نہیں ہوتا پھر بھی یہ دلکش ہوتی ہیں۔ جوں جوں مصنف پختگی

کی طرف بڑھتا ہے اس کا انفرادی راستہ واضح ہوتا جاتا ہے۔ میرزا کا صحرانورد کے خطوط اور رومان اور دنیائے آرزو کا دور اسلوب کی تلاش کا دور ہے ابھی اسے وہ آہنگ نہیں ملا جو اس کا اپنا ہے اور جو اس کے مزاج سے پوری مطابقت رکھتا ہے اسی لیے اس کے اسلوب میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

میرزا پر منشی پریم چند کے اثرات زیادہ صحت مندانہ ہیں اور دیر سے ظاہر ہوتے ہیں، پریم چند کے ہاں جو اصلاح کا روحانی جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا۔ وہ میرزا ادیب کے فن کا بھی ایک مستقل حصہ بن گیا۔ پریم چند نے ہمیں نہایت اچھے افسانے دیئے ہیں لیکن وہ جدید افسانے کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد افسانے نے بہت ترقی کی ہے اور یہ کہنے سے پریم چند پر کوئی حرف نہیں آتا کہ میرزا کے جدید افسانوں میں موضوع اور فن کی جو مکمل ہم آہنگی ملتی ہے وہ پریم چند کے ہاں موجود نہ تھی۔ اصل میں ابھی اس کا وقت ہی نہ آیا تھا۔ میرزا فن کو بحیثیت فن کے بھی اہم سمجھتا ہے اور اسے نظریات کی تشہیر کا ایک ذریعہ بھی مانتا ہے اِسی لیے اس کے فن پاروں میں جہاں فنی کمال موجود ہے وہاں کسی نہ کسی لحاظ سے معاشرے اور زندگی کی ترقی اور بہتری کی آرزو بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ یوں پریم چند کا اثر داستانی دَور کے مصنّفین اور حجاب وغیرہ کے اثر سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔ جدید افسانے میں میرزا نے پریم چند کے علاوہ اپنے ہاں کی ترقی پسند تحریک اور جدید مغربی مصنّفین سے بہت گہرا اثر لیا ہے انگریزی ادب کا ہمارے ادب پر براہ راست اور بہت گہرا اثر ہے اور ہماری جدید ادبی و تنقیدی روایات کے رشتے مغربی بالخصوص ادب سے جا ملتے ہیں۔ اردو افسانے میں جو کچھ میرزا نے کیا اور جو کچھ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے کیا اس کی تخلیق میں اگرچہ ملکی حالات سب سے بڑا محرک رہے ہیں تاہم مغربی ادب کے روز افزوں مطالعے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عربی و فارسی کے اثر کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اب ہم جو کچھ سیکھ رہے ہیں وہ انگریزی کے ذریعے ہم تک پہنچ رہا ہے اور اسی مطالعے نے میرزا کو افسانے کی نئی ساخت سے آشنا کیا ہے۔ اسے نئے سانچے دیئے ہیں اور اس کے رہوار تخیل کو کھڑا ہونے کے لیے انفرادی اسلوب کی زمین عطا کی ہے۔

عرش صدیقی

۳۰ اگست ۱۹۶۲ء

گورنمنٹ ایمرسن کالج، ملتان

ملکۂ مصر

محترم دوست ــــــــــــــــــــ

آج تمہارے دُور افتادہ صحرانورد دوست کو، تمہاری شورش انفزا دنیا کے دلچسپ مناظر کو چھوڑے ہوئے پورے تین سال گزر چکے ہیں، ان تین برسوں میں میری نگاہوں نے ہیبت آفریں صحراؤں، ہولناک پہاڑوں، مٹی اور ریت کے مہیب تودوں، گنجان اور بلند درختوں کے علاوہ شاذ و نادر ہی کوئی چیز دیکھی ہے۔ اب مجھے قدرت کے ان لرزہ خیز مناظر سے محبت سی ہو گئی ہے۔ اور جیسے جیسے میرے قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں، نئے سے نئے حیرت انگیز واقعات سامنے آتے جاتے ہیں: دوست! میں ایک ایسی دلآویز، رومانیت انگیز دنیا میں سانس لے رہا ہوں جس کی دلچسپیاں تمہارے تصورات سے بھی بالاتر ہیں!

صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو آفتاب کی شعاعِ اولیں، میرے لیے ایک رومانِ تازہ اپنے آغوشِ زریں میں لے کر آجاتی ہے اور جب دن بیت جاتا ہے تو رات کی تاریکی عجیب و غریب، پراسرار واقعات کی دنیا دامن میں لیے نمودار ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھو، صحرا ایک ضخیم کتاب ہے جس کے ہر صفحے پر بے شمار رومان بکھرے پڑے ہیں۔ میری نظریں بھونرے کی مانند، جو پتّی پتّی کا رس چوستا ہے اور اس پر بھی اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ نئے نئے رومانوں کو پڑھ رہی ہیں۔

تم میرے خطوں کو، میرے افسانوں کو کتنی دلچسپی سے پڑھتے ہو۔ یہ میں نہیں جانتا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ میرا ہر ایک افسانہ تمہارے دل پر بھی وہی اثرات طاری کرتا ہوگا۔ جو اب

تک میرے دل پر مرتسم ہیں۔ اور معلوم نہیں کب تک مرتسم رہیں گے۔

چند دن سے میں افریقہ کے صحرا "کبیر شن زار" میں، اپنے رفیقِ سفر آغا بہرام کے ساتھ قدرت کی دلآویز رنگینیوں میں گھرا ہوا ہوں، اور یہاں اتنی دلچسپی محسوس کر رہا ہوں کہ اس کے عوض شہر کی زندگی جاوداں بھی نہ لوں۔ تم میرے اس بیان کو محض شاعرانہ مبالغہ سمجھو گے ـــــ مگر دوست! دنیا کی ہر نئی چیز انسان کے ذہنِ نارسا کے لیے مبالغہ ہی ہوتی ہے۔ کاش تم میری مسرتوں کا اندازہ کر سکو۔

آج میں تمہارے سامنے ایک ایسا رومان پیش کر رہا ہوں جو میرے پچھلے رومانوں سے بہر لحاظ بہتر، دلچسپ، دلآویز ہے۔ میں اسے خود کئی بار پڑھ چکا ہوں اور ہر بار پہلے سے زیادہ دلچسپ محسوس کیا ہے۔ امید ہے تم بھی اسے بہت پسند کرو گے۔

آج سے چھ روز پیشتر نصف دن گزرے، جبکہ آفتاب نصف النہار پر تیزی سے چمک رہا تھا اور اس کی گرم شعاعوں کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا: میں اور آغا بہرام ایک درخت کے نیچے سستا رہے تھے۔ یکایک ذراتِ ریگ کا ہجوم اٹھ اٹھ کر آسمان کے نیچے تاریک وکثیف بادلوں کی صورت میں منڈلانے لگا۔ پگھلتے ہوئے برف کے ٹکڑوں کی طرح مٹی کے بڑے بڑے تودے، تیز و تند جھونکوں میں تحلیل ہونے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں اجسامِ خبیثہ کے لشکر دوڑ رہے ہیں اور عنقریب پوری کائنات تباہ ہو جائے گی۔ بادِ سموم کے تھپیڑے درختوں سے ٹکرا کر اس طرح شور کر رہے تھے، گویا بے شمار اندھے ایک تاریک کنوئیں میں گر پڑے ہیں۔ اور اپنی جان کے خوف سے بے اختیار چیخ پکار رہے ہیں۔ جس درخت کے نیچے ہم کھڑے تھے اس کے پاس ہی ایک غار تھا ہم بعجلت اس غار میں چلے گئے۔ صحرا میں جب بادِ سموم چلتی ہے تو ہم کسی محفوظ جگہ چھپ جاتے ہیں۔ کیونکہ بادِ سموم کے ہلاکت آور جھونکوں کے سامنے کھڑے ہونا یقیناً موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ یہ غار ہمارے لیے نہایت اچھی جائے پناہ ثابت ہوئی۔ آدھ گھنٹہ ہم وہیں بیٹھے رہے اور جب میں نے باہر نکل کر دیکھا کہ یہ طوفانِ آتشیں تھم گیا ہے تو اپنے رفیقِ محترم کو آگے چلنے کے لیے آواز دی۔ مگر اس نے مجھے اندر بلا لیا۔

آغا بہرام کے پاس ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا۔

"یہ صاحب بھی ہماری طرح یہیں کھڑے تھے۔" آغا بہرام نے کہا۔

"آپ کو بھی سیاحت کا شوق ہے؟" ـــــ میں نے اس سے پوچھا۔

غار کے شگاف میں سے مدھم روشنی اس کے گرد آلود چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اور اس کی صورت بہت خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے گھور کر ہم دونوں کو دیکھا اور باہر نکلنے کے لیے کہا۔ ہم تینوں باہر نکل آئے۔ اب فضا سکون پذیر تھی۔ سورج چمک رہا تھا۔ ہم درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

"غالباً تم سیاح ہو!" اس بوڑھے نے ہمارے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں!" آغا بہرام نے جواب دیا۔ "ہم صحرا نورد ہیں اور آپ بھی غالباً اسی جنون میں مبتلا ہیں؟"

"میں بہت صحرا نوردی کر چکا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اب چند سال سے اس صحرا میں رہتا ہوں۔ دن بھر جنگل میں گھومتا رہتا ہوں۔ شکار کرتا ہوں۔ اور رات کے وقت اس غار میں سو رہتا ہوں۔ میں بھی ایک دن جوان تھا اور جوانوں کی طرح گھوما کرتا تھا۔ مگر اب میری زندگی کا چراغ بجھ رہا ہے......ٹانگوں میں زیادہ چلنے کی ہمت نہیں۔ جوان آدمی واقعی خوش قسمت ہوتے ہیں!"

"تو آپ تنہا اس غار میں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! کیا ہرج ہے؟" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"یہ میں نے اس لیے پوچھا کہ بڑھاپے میں ایک ہمدم کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔"

"ہمدم!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے کئی ہمدم ہیں۔"

یہ شخص چند گھنٹوں کے بعد ہم سے بے تکلفانہ گفتگو کرنے لگا۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ اور جب اسے یقین ہو گیا کہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے تو اس نے غار میں سے ایک سنگِ مرمر کا ڈبہ لا کر میرے ہاتھوں پہ رکھ دیا۔ میں نے اسے کھولا۔ اس میں کاغذات کا ایک پلندہ تھا۔

"یہ کیا ہے ؟" میں نے پوچھا

"ان ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے کمزور نحیف آواز میں کہنا شروع کیا۔ "ان اوراق میں تین ہستیوں کی سرگزشتیں درج ہیں۔ جنھوں نے محبت کی، جو محبت کی گئیں اور جنھوں نے آخر محبت ہی کے ہاتھوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موت کا شربت پیا۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور اس نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا

"ان میں سے ایک تو مجھے لکھی لکھائی ملی۔ اور میں نے پھر اسے اپنے الفاظ میں لکھا۔ یہ سرگزشت مصر کی ملکہ کی ہے اور باقی دو سرگذشتوں کو میں نے دوسروں کی زبانی سنا اور پھر انھیں لکھ لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں میری زندگی کی تنہا دلچسپی انھی افسانوں سے وابستہ تھی۔ اب چونکہ موت کے دروازے پر پہنچ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گیا ہوں، اس لیے یہ اوراق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ تم انھیں بے حد دلچسپ پاؤ گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکثر چٹانوں پر بیٹھ کر ان افسانوں کو پڑھنے سے مجھے بے حد لطف حاصل ہوتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ افسوس وہ زمانہ گزر گیا!"

ایک دن اور زندہ رہ کر یہ نیک دل بوڑھا دنیا سے رخصت ہوگیا۔ میں نے افسانوں کو پڑھا۔ یہ کتنے دلچسپ ہیں؟ کتنے دلآویز؟ اس کا اندازہ تم خود لگا سکو گے۔

آج پیارے دوست! میں پہلا رومان یعنی "ملکۂ مصر" تمھاری زبان میں لکھ کر تمھیں بھیج رہا ہوں۔ میں نے اس کے پیرایۂ بیان کو بہت حد تک بدل دیا ہے۔ مگر واقعات وہی ہیں۔ یہ داستان، آگیطی، ملکۂ مصر کی ہمدم وانیس، اور محل کی سب سے بڑی خادمہ کی زبانی ہے۔ آگیطی نے یہ واقعات معبدِ رع کے ایک محافظ کو سنائے اس نے یہ واقعات کسی اور کو سنائے۔ آخر کار ایک عورت نے انھیں لکھ لیا اور اس طرح یہ داستان محفوظ رہی۔ یہ چیزیں مجھے مرحوم بوڑھے نے بتائی تھیں۔ میں عنقریب دوسرے رومان بھی تمھاری خدمت میں بھیجوں گا۔

تم سے ملنے، تم سے باتیں کرنے کا بے حد خواہشمند تمھارا دُور افتادہ دوست!

"صحرانورد"

(۱)

آغازِ داستان!

اے معبدِ رع کے محافظ! چونکہ تم میرے عزیز ہو، اور میرے دل میں تمہاری عزت ہے۔ اس لیے میں تمہاری درخواست کو رد کرنا نہیں چاہتی۔ میں تمہاری آرزو کے مطابق تمہیں وہ تمام تحیر افزا واقعات سناؤں گی جو چند سال سے مجھے پیش آرہے ہیں ——— !

"تم جانتے ہو، مصر و یونان میں ہمیشہ عداوت رہی ہے۔ فرعون، رعمیس دوم کے زمانہ حکومت میں مصری سپاہیوں نے یونان پر حملہ کیا اور بے شمار یونانیوں کو، جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ قیدی بنا کر مصر میں لے آئے اور ان میں سے بیشتر تعداد کو سخت بے رحمی سے قتل کر ڈالا۔ بہت سے یونانی چھپ گئے اور اس طرح ان کی جان بچ گئی۔ اسی اثناء میں فرعون فوت ہوگیا۔ اس کی نعش "عمل حنوط" کے لیے محل کے آخری تہ خانے میں پہنچا دی گئی۔ رات کو میں یہ دیکھنے کے لیے کہ تہ خانے کے اردگرد خفیہ راستوں پر پہرہ دار اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔ تہ خانے کی جانب جانے لگی۔ کئی پہرہ دار سو چکے تھے۔ میں نے خاموشی کے ساتھ تہ خانے کا دروازہ کھولا۔ سب سے پہلے میری نظر فرعون کے تابوت پر پڑی۔ تابوت کے اردگرد سیاہ چراغ جل رہے تھے۔ عود و عنبر کی خوشبو سے کمرے کی فضائیں مہک رہی تھیں۔ فرعون کا سر تابوت سے باہر نظر آرہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کے سر کو دیکھا اور عقیدت مندانہ جذبات سے میرا سینہ لبریز ہوگیا۔ میں نعش پر جھک گئی۔ یکایک میرے کانوں میں مدھم سی آواز آئی۔ اس بات سے مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ وہاں داخل ہونے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے حیران ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرے کے آخری کونے میں دو سائے نظر آرہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چل کر ان کے پاس پہنچی۔ اس وقت جو منظر میری نگاہوں نے دیکھا، اسے میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔

مدھم روشنی میں مجھے ایک عورت اور ایک لڑکی نظر آئی۔ دیوار سے لگ کر ان کے پاس کھڑی ہوگئی۔ روشنی کم ہو جانے کی وجہ سے میں ان کے چہروں کو بخوبی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تاہم میں محسوس کرتی تھی۔ کہ وہ یونانی عورتیں ہیں ان کے چہروں سے انتہائی مایوسی ٹپک رہی تھی۔

ادھیڑ عمر کی عورت نے جو لڑکی کی ماں معلوم ہوتی تھی۔ اپنے ہاتھ میں سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی صندوقچی پکڑی ہوئی تھی دونوں خاموش کھڑی تھیں۔ اس وقت میرے سامنے عجیب پر اسرار منظر تھا۔ کمرے میں خوف انگیز، خوف آور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ان کے سانسوں کی مدھم آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ جہاں میں کھڑی تھی وہاں کامل تاریکی تھی۔ اس لیے وہ مجھے بالکل نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ مگر ان کے ارد گرد مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فرعون کے تابوت کی طرف ان کی پشت تھی۔ ادھیڑ عمر عورت نے لمبی آہ بھری، اور لڑکی کے کندھے پر دایاں ہاتھ رکھ کر مغموم آواز میں کہنے لگی۔

"یوروپا! میری بچّی! اگر ہم کچھ دیر اور یہاں رہے تو مصری جلاّد ہمیں قتل کر ڈالیں گے!"

"تو بھاگ جائیں ماں!" لڑکی نے بھولے پن سے کہا۔

"کہاں بھاگ جائیں ..... جہاں جائیں گے وہیں مصری جلاّد ہمیں پکڑ لیں گے۔ اوّل محل سے نکلنا ہی محال ہے وہ عنقریب آئیں گے۔ او .... خدائے زیوس کی ان پر لعنت ہو!"

میں سمجھ گئی۔ کہ یہ یونانی عورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک ماں ہے، اور دوسری لڑکی۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے یہاں چھپی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہونے سے پیشتر میں نے ان کی گفتگو کو سننا مناسب خیال کیا۔

"تو اب کیا کرنا چاہیئے ماں؟" لڑکی نے پوچھا

"کچھ بھی نہیں ..... مصری جلاّد ابھی آ کر ہمیں قتل کر ڈالیں گے!"

"نہیں ماں!" لڑکی خوف سے کانپنے لگی۔ اس پر ماں نے اس کے بازوؤں کو پکڑ لیا۔

"خاموش!" ماں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا:۔

"زہر کھا کر مرنا ذلیل مصریوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے ہزار درجہ بہتر ہے بیٹی!"

"مجھے موت سے ڈر آتا ہے، ماں!"

"مگر ہم کسی حالت میں بھی موت سے نہیں ڈرتے، خدائے زیوس کی قسم، ہم مصریوں کے ہاتھوں ذلیل موت کبھی بھی قبول نہیں کریں گے۔" اب اس کی آواز میں قدرے جوش

پیدا ہو گیا تھا۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے صندوقچی میں سے کچھ نکالا۔ اور جلدی سے اسے منہ میں ڈال لیا۔ پھر اپنے ہاتھوں کو لڑکی کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے ماں؟"

"زہر!"

"زہر؟ ماں ...... مجھے موت سے ڈر آتا ہے —— ماں!"

"ذلیل موت سے یہ موت بہتر ہے۔"

"ماں —— ماں!!"

لڑکی کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل تڑپ گیا۔ میں بے اختیاری کے عالم میں آگے بڑھی۔ اور اس کی ماں کے ہاتھ کو پیچھے ہٹا دیا۔ لڑکی دم بخود ہو گئی۔ ماں لڑکھڑانے لگی۔ صندوقچی اس کے ہاتھوں سے نکل کر سیاہ پردے پر جا گری۔

"خدائے زیوس کی تم پر لعنت ہو!" یہ کہتے ہوئے عورت نے لڑکی کی گردن کے گرد ہاتھ حمائل کر دیئے۔ زہر اس کی رگوں میں پوری طرح اثر کر چکا تھا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔

"ظالم، خونخوار!" یہ کہہ کر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ میں نے لڑکی کو پکڑا اور اسے تابوت کے پاس روشنی میں لے آئی۔ وہ دم بخود تھی۔

"ڈرو مت بیٹی! تجھے کوئی مصری قتل نہیں کر سکتا۔"

لڑکی کانپنے لگی۔

"کانپ کیوں رہی ہے بیٹی؟ مجھے اپنی ماں سمجھو ...... تم میری بیٹی ہو.... میری بیٹی!!"

میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اب خوف بہت حد تک اس کے دل سے نکل چکا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

"یو ..... یورو پا!"

"یوروپا میری بیٹی یوروپا!"

یوروپا نے آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ایسا پیارا چہرہ میں نے تمام مصر میں

نہیں دیکھا تھا۔

"تو میرے پاس رہے گی، میری بیٹی یوروپا؟"

"مصری جلاد مجھے قتل کر ڈالیں گے۔"

"نہیں بیٹی ایسا نہیں ہوگا۔ میرے کوئی بیٹی نہیں ہے۔ میں تجھے اپنی بیٹی بنالوں گی۔"

"مجھے مصریوں سے ڈر آتا ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ کانپنے لگی۔

"مصری بہت مہربان ہوتے ہیں، یوروپا! تو میرے پاس نہایت آرام سے رہے گی۔ میں تجھے آرام سے محل میں رکھوں گی۔ محل کی تمام خادمائیں تیری خدمت کریں گی۔"

"مصری بے رحم نہیں ہوتے؟"

"بالکل نہیں۔ بھلا وہ تیرے جیسی پیاری لڑکی کے ساتھ کیوں کر بے رحمی کر سکتے ہیں؟ ایسا نہیں ہوگا بیٹی!"

"میری ماں نے تو کہا تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں گے!"

"تیری ماں کو سخت غلط فہمی ہوئی تھی اس نے تیرے دل میں بھی مصریوں کی طرف سے خوف پیدا کر دیا ہے۔ چلو اب چلیں۔"

"کہاں؟"

"میرے کمرے میں! ڈرو مت! دیکھو میں تمہاری ماں ہوں۔"

یوروپا جھجکی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ ہم باہر نکل آئے۔ محل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ تمام راہ ڈرتی رہی۔ ڈر ڈر کر مجھ سے لپٹتی رہی میرا بیٹا چند دن سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس لیے کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ میں یوروپا کا ہاتھ پکڑے کمرے میں داخل ہوئی اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور آپ اس کے پہلو میں بیٹھ کر اسے تسلیاں دینے لگی ——!

(۲)

کاہنِ اعظم کی پیشین گوئی!

میرے کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اس لیے میں "یوروپا" کو اپنی حقیقی بیٹی سمجھنے لگی۔ یوروپا

پچھلے واقعات کو بہت حد تک فراموش کر چکی تھی، مگر ابھی تک وہ وہی سہمی ہوئی، خوفزدہ، غمگین صورت لڑکی تھی۔ جسے میں نے تہ خانے میں دیکھا تھا۔

میں نے اسے محل کے عقب میں ایک مکان دے دیا تھا جس میں وہ رہتی تھی اور میں بھی زیادہ وقت وہیں گزارتی تھی۔ باوجودیکہ اسے وہاں رہتے ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ تاہم وہ مصریوں سے بہت خوفزدہ رہتی تھی۔ چونکہ معبدِ رع میں گئے ہوئے مجھے عرصہ گزر چکا تھا اس لیے جب ایک دن میں "یوروپا" کے پاس پہنچی اور خدائے رع کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اور "یوروپا" کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ وہ بہت ڈری اور خوفزدہ لہجے میں کہنے لگی:۔

"مجھے بہت خوف محسوس ہوتا ہے، ماں!"

"خوف؟ ابھی تک تمہیں ہر چیز سے خوف محسوس ہوتا ہے!"

"مصری بہت خونخوار ہوتے ہیں!"

"مصری تو میں بھی ہوں۔"

یوروپا نے عجب انداز سے میری طرف دیکھا۔

"مگر ماں! تم تو بہت مہربان ہو!"

"تم جیسی بھولی بھالی، پیاری لڑکی پر کون مہربان نہ ہوگا؟ چلو اب چلیں! خدائے رع کے معبد میں!"

آسمان پر تاریک وکثیف بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا میں برودت پیدا ہو گئی تھی۔ ہم دونوں خاموشی کے ساتھ مکان سے نیچے اترے اور معبد الاقصر، کی طرف چلنے لگے۔ تمام راہ یوروپا ڈرتی ہوئی کانپتی ہوئی میرے ساتھ چلتی رہی۔ کچھ دیر بعد ہم معبد کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یوروپا خوف سے کانپنے لگی۔ وہ معبد کے اندر جانا نہیں چاہتی تھی اور بار بار مجھ سے لپٹ جاتی تھی!

بیٹی ڈرو مت! دیکھو، تمہاری ماں تمہارے پاس کھڑی ہے۔"

"میں نے سنا ہے یہاں قربانیاں کی جاتی ہیں!"

"مگر تمہیں کیا یوروپا! کاہنِ اعظم بہت مہربان ہے۔ . . . . مت ڈرو بیٹی!"

یہ سُن کر اسے کچھ تسلی ہوئی اور وہ مجھ سے علیٰحدہ ہو کر چلنے لگی۔ ہم پہلے کمرے میں پہنچے۔ یورو پا بے اختیار ہو کر مجھ سے لپٹ گئی اور خوف کی ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک معمر شخص جس کی شکل انتہائی خوفناک تھی، گھور گھور کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں کئی مرتبہ معبد میں گئی تھی مگر یہ بوڑھا میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ چند لمحوں کے بعد ہم خدائے رع کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ کاہن اور کاہنات خوش آئند آواز میں گیت گا رہی تھیں۔ معبد کی فضاؤں میں خوشبو کی لہریں تیر رہی تھیں۔ گیت جاری تھا ——!

"تو بیدار ہو۔ اے نیکوکار۔ اے خدائے رع! اے آسمان کے دونوں کناروں کے مالک! اے روشنی دینے والے خداوند! اے خدائے رع!! تو بلند آسمانوں کی سیر کرنے والا ہے۔ تیرے دشمن تباہ ہوں اے خدائے رع! فرعون کی عمر دراز کر! اس کے پیٹ کو روٹی اور اس کے حلق کو پانی پہنچا۔ اس کے بالوں کے واسطے عطر عنایت کر۔ تمام راہیں تیری روشنی سے معمور ہیں۔ تو وہ مقدس ذات ہے۔ جس کے پروں سے بجلی پیدا ہوئی۔ تو وہ شیرِ ببر ہے، جس کی گرج سے دشمن کانپ جاتے ہیں۔ تو وہ ققنس ہے، جو مختلف رنگ رکھتا ہے! آسودہ ہو۔ اے خداوندوں کے باپوں کے باپ! اے موجودات پیدا کرنے والے، اے سب چیزوں کے بنانے والے۔ اے معبدوں کے سردار!!"

اب آواز رک گئی۔ تمام کاہن اور کاہنات چلی گئیں۔ کاہنِ اعظم ابھی تک سر جھکائے خدائے رع کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے یورو پا کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھی۔ کاہنِ اعظم نے سر اٹھایا اور مڑ کر ہماری طرف دیکھا

"خدائے رع تم پر رحم کرے آگیتلی!" اس نے کہا

"خدائے رع کی عظمت بلند ہو۔ یہ میری بیٹی ہے۔" میں نے یورو پا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کے متعلق پیشین گوئی کیجئے!"

اُس نے گھور کر یورو پا کی طرف دیکھا۔ یورو پا نے خوفزدہ ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنا

چہرہ چھپالیا ۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی ۔ کاہن اعظم سر کے بل خدائے رع کے سامنے گر پڑا ۔ اور اس کی عظمت کا گیت گانے لگا ۔ ایک طرف سے گرجتی ہوئی آواز پیدا ہوئی ۔ میں سجدے میں گر پڑی اور جب اٹھی تو میں نے دیکھا کہ یوروپا بھی سجدے میں ہے میں نے اُسے اُٹھایا ۔ اب کاہن اعظم اٹھا اور بلند آواز میں کہنے لگا ۔

"خدائے رع کے جلال کی قسم ، اس کے سر پر تاج ہوگا —— !"

یہ سُن کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی

کاہن اعظم کہے جا رہا تھا :۔

"یہ مصری نہیں ، یونانی لڑکی ہے ۔"

میں ڈر گئی ۔ کاہن اعظم پھر سجدے میں گر پڑا ۔ یوروپا مجھ سے لپٹ گئی ۔ اچانک میری نظر ایک کونے پر پڑی ، وہی بوڑھا جسے ہم نے معبد میں داخل ہوتے دیکھا تھا ۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ، یوروپا کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ . . . . . میں نے یوروپا کا بازو پکڑا اور ہم معبد سے نکلنے لگے ۔ مکان پر پہنچ کر میں اس واقعے پر غور کرنے لگی . . . . . !

کتنا پر اسرار ، کتنا عجیب و غریب واقعہ تھا ؟

"یوروپا کے سر پر تاج ہوگا" یہ بات رہ رہ کر میرے دل میں ابھر آتی ۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے ؟

انھی خیالات کو دماغ میں لیے سو گئی ۔ خواب میں دیکھا کہ یوروپا بالکل بدل گئی ہے اس کے سر پر نہایت خوبصورت چمکتا ہوا تاج نظر آ رہا ہے ۔ وہ سنہری کرسی پر بیٹھی ہے ۔ فرعون آتا ہے اور اسے آغوش میں لے لیتا ہے ۔ یکایک میری آنکھ کھل جاتی ہے ۔

یوروپا میرے پہلو میں سو رہی تھی ۔ سوتے میں اس کا چہرہ نہایت خوب صورت دکھائی دے رہا تھا ۔

"ماں !" اس نے آنکھ کھول کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا ۔ "وہ خوفناک چہرے والا بوڑھا کون تھا ۔ جس نے معبد میں گھور کر مجھے دیکھا تھا ؟"

"وہ خوفناک بوڑھا —— ؟ کوئی ہوگا ہمیں کیا ؟ ؟"

"خدائے رع کا کاہن ہوگا!" یہ کہہ کر وہ اُٹھ بیٹھی اور میں طرح طرح کی دلچسپ باتوں سے اس کا دل بہلانے لگی۔

(۳)

ایک پُراسرار واقعہ!

مندرجہ بالا واقعے کے بعد یوروپا پہلے سے بھی زیادہ گُم سُم، خاموش اور افسردہ رہنے لگی۔ اس رات کے واقعے کو جب میں سوچتی ایک مبہم سا جذبۂ خوف میرے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہو جاتا۔ میں نے کئی بار اس موضوع پر یوروپا سے گفتگو کرنا چاہی۔ مگر وہ ہر بار ایک لفظ نکالے بغیر، مایوسانہ نظروں سے مجھے دیکھ کر خاموش ہو جاتی۔ کاہنِ اعظم کی پیشین گوئی کو وہ اس کی ستم ظریفی سمجھتی تھی۔

تختِ حکومت پر فرعون (منفتا) بیٹھ چکا تھا۔ وہ ایک خوش رُو، وجیہہ نوجوان تھا۔ نہ صرف وجیہہ بلکہ نیک طینت بھی تھا۔

اس شام کو جس کا ذکر کرنے لگی ہوں۔ یوروپا قدرے بشاش تھی۔ وہ مکان کے نیچے باغ میں ٹہل رہی تھی۔ میں کمرے کی کھڑکی سے دور افق کو، جہاں سنہری بادل لہرا رہے تھے، دیکھ رہی تھی۔ مکان سے دھوئیں کے کثیف بادل اٹھ اٹھ کر، چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم ہو کر فضائے بسیط میں آہستہ آہستہ غائب ہو رہے تھے۔ معبدِ رع سے گھنٹیوں اور گیتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں ان مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ میری نگاہوں نے دور اسی خوفناک بوڑھے کو دیکھا۔ جسے معبدِ رع میں، میں اور یوروپا دو بار دیکھ چکی تھیں۔ وہ ایک تودے پر کھڑا ٹکٹکی باندھ کر ہمارے مکان کی دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ مگر جب میں نے اپنی حیثیت اور مرتبے پر غور کیا تو تمام خیالات دور ہو گئے۔

یوروپا نیچے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کو ہلاتی، پھولوں کو توڑتی ہوئی ٹہل رہی تھی۔

تھکاوٹ محسوس کر کے میں کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر تو میرا دماغ مختلف خیالات کی کشمکش میں گرفتار رہا۔ نگاہوں کے سامنے عجیب و غریب مناظر آ رہے تھے۔ کاہنِ اعظم کی

پیشین گوئی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ میرے جسمانی اضمحلال اور دماغی افسردگی نے جسم کو نیند کی گود کے حوالے کر دیا۔ یک لخت میری آنکھ کھل گئی چراغ کی تیز روشنی میری آنکھوں میں کھب رہی تھی۔

میں اُٹھ بیٹھی۔ میرا دل یوروپا کو تنہا چھوڑ کر، خود سو جانے پر خود کو مطعون کرنے لگا "خدائے رب اسے محفوظ رکھے۔ کتنی پیاری لڑکی ہے۔" یہ الفاظ میرے لبوں سے بے اختیار نکلے اور میں نے ایک کھڑکی کے پاس آکر اسے آواز دی۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ دوبارہ آواز دی۔ اب کے بھی خاموشی طاری رہی۔ میں کھڑکی سے الگ ہو کر نیچے باغ میں آئی اور اسے ڈھونڈنے لگی۔ باغ کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر یوروپا کہیں بھی نہ تھی۔ اتنا پُراسرار، خوف آور واقعہ مجھے تمام زندگی میں پہلی بار پیش آیا تھا۔ اس لیے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شاید اسے کسی نے پہچان لیا ہے، اور قتل کر دی گئی ہے۔ اس خیال کے دماغ میں آتے ہی میرا دل غم و غصّہ سے بھر گیا۔ میں اسے حقیقی معنوں میں اپنی بیٹی سمجھتی تھی اور اسے کسی صورت میں بھی خود سے جُدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ "مگر میں نے اسے تنہا چھوڑا ہی کیوں؟" یہ سوال بار بار میرے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ اگر میں اُسے اس طرح نہ چھوڑتی تو یہ ہولناک واقعہ کبھی بھی رونما نہ ہوتا۔" کتنی دیر تک اس قسم کے خیالات میرے دماغ میں چکر لگاتے رہے، اور میں پچھتاتی رہی۔ اسی اثنا میں بوڑھے کی شکل میری نظروں کے سامنے پھرنے لگی۔

"ممکن ہے یہ حرکت اسی کی ہو۔" میں نے دل میں سوچا۔ "آخر وہ بار بار چھپ کر ہمیں کیوں دیکھتا تھا؟ اور کچھ دیر پہلے دُور کھڑے ہو کر مکان کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے اُس کا کیا مقصد تھا؟"

جیسے جیسے ان خیالات کا ہجوم میرے دماغ میں زور پکڑتا جا رہا تھا۔ میری رُوح غم کے تلخ احساسات کی زنجیروں میں گرفتار ہوتی جاتی تھی۔

آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ میں باغ سے باہر نکلی۔ اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اپنی بے چارگی پر مجھے خود افسوس ہو رہا تھا۔ پہلے تو میں نے چاہا۔ کہ

محل میں جاکر اپنے بیٹے سے یہ واقعہ بیان کر دوں ۔ اور اس کی مدد سے یوروپا کو ڈھونڈوں. مگر یہ مناسب خیال نہ کیا۔ آخر کار میں ایک طرف چلنے لگی اور مجبور و خستہ ہو کر پھر باغ میں پہنچی اور شدتِ ملال سے گر پڑی۔

میں لیٹی رہی اور جب اٹھی تو آسمان پر ستارے ماند پڑ چکے تھے. کاہنوں کے گیت فضا میں لہرا رہے تھے ۔ اچانک ایک طرف سے یوروپا آتی ہوئی دکھائی دی ۔ میں فوراً اس کے پاس پہنچی اور بے اختیار اس سے لپٹ گئی ۔

"یوروپا! میری بیٹی تو کہاں چلی گئی تھی ؟"

اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے اثرات نمایاں تھے ۔

"تو اتنی خوفزدہ کیوں ہے ؟" میں نے پھر پوچھا۔

"میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں ، ماں ؟"

"تو کسی مصیبت میں نہیں پھنس سکتی، یوروپا !"

"مجھے اوپر لے چلو۔" اس نے کمزور و نحیف آواز میں کہا۔

میں نے اس کا بازو پکڑا اور ہم اوپر آ گئے ۔

"میرے ساتھ ایک عجیب حادثہ پیش آیا ہے" یوروپا نے کچھ دیر ٹھہر کر کہنا شروع کیا... اور پھر وہ ایک دم رک گئی ۔

"کیا حادثہ ؟"

"میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی ۔ میں ان سے ڈرتی ہوں. انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ اس حادثے کے متعلق ایک لفظ بھی کسی سے نہ کہوں۔" وہ ذرا ٹھہری اور پھر کہنے لگی ۔

"میں نہیں بتا سکتی ماں ! آہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں ؟"

"یوروپا !" میں نے پیار اور شفقت سے اس کی گردن کے گرد ہاتھ حمائل کر دیئے ۔

"تم مجھے اپنی ماں نہیں سمجھتیں ؟"

اس نے اس بات میں سر ہلایا

تو اس حالت میں تمہاری کوئی بات مجھ سے پوشیدہ نہیں رہنی چاہیے !"

"لیکن انھوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا ہے اور میں اُن سے ڈرتی ہوں۔"

"تمہیں کسی سے نہیں ڈرنا چاہیئے پوردیا! مجھے تمام واقعہ بتاؤ۔ تاکہ میں تمہاری اُلجھن دور کرسکوں۔ خدائے رع کی عظمت کی قسم! جب تک تم میرے پاس ہو۔ کوئی بھی تمہیں تکلیف پہنچانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ کہو بیٹی! تمام قصّہ مجھ سے کہو!"

اس پر اُس نے ڈرتے ڈرتے کہنا شروع کیا:۔

"وہی خوفناک بوڑھا، جو ہم نے معبد رع میں دیکھا تھا، چپکے سے یہاں آیا۔ میں ڈر گئی۔ اور میرا خیال تھا کہ تم مجھے دیکھ رہی ہو۔ مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا اور اس کے ساتھ ہی کہا "میں یونانی ہوں۔ اور تم بھی یونانی، ہمیں مصری کتّوں سے جان بچانی ہے۔ اس لیے میرے ساتھ چلو"

"میں اس وقت کیا کرسکتی تھی؟ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجھے مصریوں کے مظالم کے واقعات سنانے لگا۔ چلتے چلتے ہم ایک غار کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس نے غار کے اندر قدم رکھا۔ میں بھی ڈرتی ڈرتی اندر داخل ہوئی۔ اندر چراغ جل رہے تھے اور بے شمار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے اپنی گردنیں جھکالیں اور بوڑھے نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہنا شروع کیا ——!

"بیٹی! خدائے زیوس تجھے اپنی شفقت میں رکھے۔ میرا نام "ٹموس" ہے اور میں یونانی ہوں، تمہارے وطن کا باشندہ! یہاں جتنے آدمی ہیں۔ سب یونانی ہیں۔ تونے دیکھا کہ مصریوں نے یونانیوں پر کیا کیا ظلم کئے ہیں۔ انھیں کس بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ کن کن ظالمانہ طریقوں پر انھیں ہلاک کرکے ان کے جسموں کو جنگلی جانوروں کے آگے پھینکا گیا ہے۔ کیسے کیسے عذاب دے دے کر ہزاروں یونانیوں کو تہ تیغ کیا گیا ہے، تو یہ سب کچھ جانتی ہے اور تجھے یہ سب کچھ جاننا چاہیئے۔ ہم جان بچاکر یہاں چھپے ہوئے ہیں، اور چاہتے ہیں۔ کہ مصریوں سے اپنے مقتول بھائیوں کا بدلہ لیں مگر یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب ہم اپنے ملک میں بآرام پہنچ جائیں۔ تاکہ وہاں جاکر انتقام لینے کی کوشش کریں...... ہم مصریوں

سے ضرور بدلہ لیں گے۔ کیا تو وعدہ کرتی ہے کہ اگر تجھے یہاں طاقت وعزت حاصل ہوئی تو ہماری حفاظت کرے گی اور مصریوں سے بدلہ لے گی؛ بیٹی تو یونانی ہے۔ مصری ہمارے دشمن ہیں!"

میں خاموش رہی۔ وہ پھر بولی :۔

"میں معبدِ رع کے کاہنِ اعظم کی پیشین گوئی سن چکا ہوں۔ اگر وہ پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی تو کیا تم یونانیوں کی مدد کروگی ؟"

اب ایک حسین نوجوان میرے سامنے آیا۔

"بیٹی یہ یونانی فوج کا افسر تھا۔ اس کا نام "میرون" ہے"۔ بلوس نے کہا۔

اس نے بھی بوڑھے کے الفاظ دہرائے۔

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں!" میں نے مجبور ہوکر کہا

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔

"خدائے زیوس کی قسم کھاؤ!" بوڑھے نے مشفقانہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے خدائے زیوس کی قسم کھاکر وعدہ کیا۔ اس کے بعد بوڑھے نے میرے بازو میں سے خون کے چند قطرے نکالے اور انھیں ایک ڈبیہ میں ڈال دیا۔ پھر میرے سر کے کچھ بال نوچ لیے اور انھیں بھی وہیں رکھ دیا۔

"یہ تمہارے وعدے کی علامت ہے۔ خدائے زیوس تجھے وعدے کی تکمیل میں مدد دے"۔

اس کے بعد بوڑھا مجھے یہاں چھوڑ گیا ——— !

"ماں یہ کیسی مصیبت ہے! تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹی!" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا

"مگر اب کیا ہوگا ماں ؟"

"کچھ بھی نہیں!"

"وہ بوڑھا مجھے پھر وہاں لے جائے گا"۔

"نہیں، اب میں تجھے کبھی تنہا نہ چھوڑوں گی"۔

"مگر ماں! وہ بے شمار آدمی تھے ۔"

"اگر تم مصر کی ملکہ بن جاؤ۔ تو ان کے ساتھ کیا کرو گی؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں ان تمام کو قتل کرا دوں گی ـــــــ" اس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور وہ سو گئی۔

(۴)

شاہی محل میں!

چند دن سے یوروپا بہت بے قرار تھی۔ خوفناک و دہشت افزا واقعات نے پے در پے رونما ہو کر اس کے دل پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ ایسی پیاری اور خوب صورت لڑکی کو خوف و فکر سے لرزتے ہوئے کانپتے ہوئے دیکھ کر میرا دل بھی بھر آتا تھا۔ میں اسے آرام پہنچانے، اس کا غم غلط کرنے کے لیے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھی۔ راتوں کو اسے خدائے رع اور ربۃ آئی سیز کے جلال وقوت کے واقعات سناتی۔ اپنی گذشتہ زندگی کے عجیب وغریب قصے بیان کرتی۔ مگر وہ ان میں کوئی دلچسپی محسوس نہ کرتی۔ اس کی بیقراری بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک صبح کو جب وہ اٹھی تو اتنی بے قرار و مضطرب تھی کہ میں ڈر گئی۔

"چلو بیٹی یوروپا! باہر چل کر سیر کریں۔"

"باہر؟ ـــــــ باہر ماں؟"

"کیا ہرج ہے بیٹی؟"

کچھ دیر بعد ہم نیل کے کنارے پر ٹہل رہے تھے۔ مادرِ نیل کی رنگ دار دہاں موجیں بار بار اٹھ کر، ہلکا سا ترنم پیدا کر کے ساحل پر بکھرے ہوئے کہر اور دھند میں ملفوف جہازوں کے شکستہ ٹکڑوں، چھوٹی چھوٹی چٹانوں، ریت اور مٹی کے تودوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں۔ پانی کے سینے پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ ملاحوں کے ترنم ریز گیتوں سے فضا معمور تھی۔ ایک طرف 'معبدِ رع' کی بلند عمارت سر اٹھائے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ آسمان کی مشرقی وسعتوں میں خدائے رع عظمت و جبروت

کے ساتھ نمودار ہو رہا تھا۔ ہر چیز دُھند کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے یوروپا کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ میرے پاس ایک تودے پر ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی رکھے اور افق پر نگاہیں گاڑھے یوں بیٹھی ہوئی تھی۔ گویا مصر کی ملکہ کسی سوچ میں غرق ہے۔ اُسے دیکھتے ہی میرے کانوں میں کاہنِ اعظم کے الفاظ گونجنے لگے۔ میں نے پیار سے یوروپا کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک اٹھی۔

"اب تو تو خوش معلوم ہوتی ہے نا بیٹی!"

اس نے میری طرف نظریں اٹھائیں۔ آہ ان میں حسرت و مایوسی کروٹیں لے رہی تھی۔ اس چیز کے باوجود وہ نہایت خوب صورت نظر آ رہی تھی —— یکایک سطحِ آب پر مجھے ایک زرّیں بجرہ دکھائی دیا۔ یہ فرعون کا بجرہ تھا۔ خدّام ساحل سے لوگوں کو ہٹانے لگے۔

"ماں یہ کس کا بجرہ ہے؟

"فرعون کا بیٹی!"

"فرعون کا؟ ..... ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیئے!" ..... وہ خوفزدہ آواز میں کہنے لگی۔

"تم ڈرتی کیوں ہو یوروپا؟ فرعون سے — کیوں ڈرتی ہو؟"

"میں یونانی ہوں۔"

"پھر کیا ہُوا، فرعون بڑا مہربان شخص ہے۔"

"وہ مجھے گرفتار تو نہیں کرے گا؟"

"کیسی بھولی بھالی باتیں کر رہی ہو۔ فرعون تو تمہیں دیکھ کر خوش ہوگا۔"

"ماں، مجھے چھپا لو۔"

اب بجرا ساحل کے پاس پہنچ گیا تھا۔ خدام نے ایک سنہری سیڑھی بجرے سے لگا دی اور فرعون نیچے اُترنے لگا۔ وہ اس وقت نہایت وجیہہ اور شاندار شخصیت معلوم ہوتا تھا۔ نیچے اتر کر اس نے چاروں طرف نظر اٹھائی۔ یکایک اس کی نظریں یوروپا کے

چہرے پر آ کر رُک گئیں۔ یوروپا نے اُسے ڈرتے ہوئے، جھجکتے ہوئے دیکھا۔ فرعون برابر اُسے دیکھ رہا تھا۔ یوروپا گھبرا کر مجھ سے چمٹ گئی۔ فرعون نے مجھے دیکھا اور اس کے بعد خدام کے ہجوم میں واپس چلا گیا۔ یہ واقعہ اتنی جلدی پیش آیا کہ فرعون کے جانے کے بعد بھی چند لمحے میں حیران و پریشان وہیں کھڑی رہی۔ پھر میں اور یوروپا اپنے مکان کی طرف چلنے لگیں۔ راستے میں نہ تو میں نے یوروپا سے کچھ کہا اور نہ یوروپا نے مجھ سے بات کی۔ فرعون نے محبت بھری نظروں سے یوروپا کو دیکھا تھا۔ میں سوچنے لگی کیا کاہنِ اعظم کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوگی؟

اس خیال کے آتے ہی میں یوروپا کے پاس گئی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں فرعون کے بجرے پر گڑی تھیں جو ساحل کے پاس نظر آ رہا تھا —— وہ پھر میری طرف مڑی۔

"وہ فرعون ہی تھا ماں؟" اس نے کہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر حیرت انگیز تبدیلی دیکھ رہی تھی۔

"ہاں بیٹی!"

"فرعون —— فرعون!!"

"کیا ہے بیٹی؟"

اس نے صرف مجھے دیکھا، اور خاموش ہوگئی۔ اس کے بعد تمام دن وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے بیشتر وقت کھڑکی کے پاس گزارا اور بار بار مجھ سے فرعون کے متعلق دریافت کیا۔ رات بھی یونہی گزر گئی۔ صبح کے وقت میں نے خود کو فرعون کے خاص خادموں کے نرغے میں پایا۔ وہ مجھے فرعون کے حضور میں لے گئے۔ جس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا:۔

"وہ لڑکی کون ہے جو کل تمہارے ساتھ تھی؟"

"وہ ...." مجھ سے آگے نہ بولا گیا۔

"اسے جلد لاؤ!" یہ اس کا دوسرا حکم تھا۔ اس وقت میں عجیب مصیبت میں گرفتار تھی۔

اور جب مکان میں پہنچ کر یورِ دِپا سے کہا۔ " فرعون تمہیں بُلا رہا ہے"۔ تو وہ رونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ اور اسے لے کر فرعون کے حضور میں پہنچی۔ یورِ دپا میرے پہلو میں کھڑی کانپ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی فرعون کی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمکنے لگیں۔ اس نے یورِ دپا کو پاس بلایا اور اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ پھر مجھے اور تمام خدام کو چلے جانے کا حکم دیا ہم وہاں سے باہر نکل آئے۔

(۵)

ملکۂ مصر!

جب میں یورِ دپا کو فرعون کے پہلو میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو میرے دماغ میں خیالات کا ہجوم بیقرار تھا۔ میں نے کمرے کے دروازے بند کر دیئے، اور پلنگ پر لیٹ کر ان تمام حیرت انگیز واقعات پر غور کرنے لگی، جو میرے سامنے رونما ہوئے تھے۔ کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا —— مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک خیال کے دماغ میں آتے ہی میرے دل کی گہرائیوں میں جذبۂ مسرت انگڑائیاں لینے لگا۔ "کاہنِ اعظم کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی ہے اور یورِ دپا مصر کی ملکہ ...." مگر اس کے ساتھ جب مجھے اس چیز کا احساس ہوا کہ یورِ دپا مجھ سے چھن جائے گی تو میری تمام مسرت خاک میں مل گئی۔ یورِ دپا کو میں کسی حالت میں بھی خود سے جدا کرنے پر تیار نہیں تھی۔ وہ میری بیٹی تھی —— میں اسے حقیقی بیٹی ہی سمجھتی تھی۔ وہ بھی مجھے اپنی ماں سمجھتی تھی۔ کیا ملکہ بن کر بھی وہ مجھے ماں ہی سمجھے گی؟ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مصر کی ملکہ بن کر، وہ ایک معمولی عورت کو ماں سمجھے؟ یہ خیالات برابر میرے دماغ میں آتے رہے۔ کبھی میں فکرمند ہوتی تھی، اور کبھی مسرت کی لہریں میرے دل میں تیرنے لگتی تھیں۔ اسی اثنا میں دروازہ کھلا۔ اور میرا بیٹا "زاعموت" داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بشاشت برس رہی تھی۔ آنکھیں مسرتِ فراواں سے چمک رہی تھیں۔

"تم کیا کر رہی ہو ماں؟"

"کچھ نہیں، میں نے جواب دیا۔

"آج رات بہت بڑا جشن ہونے والا ہے۔ فرعون نے اپنی ملکہ کا انتخاب کر لیا ہے۔ اسی خوشی میں جشن ہونے والا ہے۔"

"فرعون کی ملکہ ...... مصر کی ملکہ؟"

"تم جشن کی تیاریوں میں حصہ نہیں لے رہی ہو ماں؟"

میں خاموش رہی۔ اور وہ چلا گیا

"ملکۂ مصر..... یوروپا ..... میری بیٹی" میں ان الفاظ کو بار بار دہرانے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ گویا مجھ سے میری حقیقی بیٹی چھن گئی ہے۔ کاش میری یوروپا میرے ہی پاس رہتی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلی اور جشن میں حصہ لینے کی غرض سے چلی گئی۔ جتنی دیر میں وہاں رہی۔ انہی خیالات کا ہجوم میرے دماغ کو بیقرار کرتا رہا —— یوروپا سے ملنے کے لیے میں نے بہت کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچی تھکاوٹ کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ آخر کھڑکی کے پاس لیٹ گئی۔ شام کی سیاہی بتدریج پھیل رہی تھی۔ میرے سامنے تاحدِ نظر پانی ہی پانی تھا۔ جہاز فضا پر چھائے ہوئے گرد و غبار کو چیرتے ہوئے آہستہ آہستہ افق کی تاریکیوں میں غائب ہو رہے تھے۔ دُور اُونچے اُونچے درخت ہوا کے جھونکوں سے سرنگوں ہو ہو کر آہیں بھر رہے تھے۔

محل کے صحن سے شور سنائی دے رہا تھا۔ جشن شروع ہو چکا تھا۔ میں اُٹھی اور محل کے صحن میں پہنچی۔ میری نگاہیں ہزاروں جشن دیکھ چکی تھیں۔ مگر جو شان و شوکت، آرائش و زیبائش اس موقعے پر دیکھی وہ میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

ہر طرف روشنی کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ رنگین و منقش قالین بچھے تھے۔ جن پر طرح طرح کے رنگین پھول بکھرے ہوئے تھے۔ رنگین و جمیل پردے لہرا رہے تھے۔ غرض کہ یہ جشن اپنی شان و تجمل کے لحاظ سے گزشتہ تمام جشنوں سے بڑھ گیا تھا۔ لیکن جشن کی کوئی دلچسپی مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی تھی —— میں اپنی یوروپا کو ڈھونڈ رہی تھی ——

یوروپا میری بیٹی!

میں آگے بڑھی۔ حبشی غلام قطار اندر قطار شرابوں کے ساغر اٹھائے پھر رہے تھے، اور بار بار میرے سامنے آجاتے تھے اس لیے میری نظریں یوروپا کو دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اچانک میں نے ایک طرف ایک ایسا منظر دیکھا کہ بے اختیار مبہوت ہو کر رہ گئی۔ یوروپا فرعون کے پہلو میں بیٹھی مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ نہایت خوش و خرم تھی۔ خوف کا ذرہ بھر احساس اس کے چہرے سے عیاں نہیں تھا۔

میرے دل میں خیال پیدا ہوا "کیا یہ وہی یوروپا ہے جو مصریوں کو دیکھ دیکھ کر کانپ کانپ کر مجھ سے لپٹ جاتی تھی؟" خواصیں مؤدبانہ طور پر اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ اس نے اشارے سے مجھے بلایا اور اپنے تخت سے کچھ فاصلے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں بیٹھ گئی۔ جشن آدھی رات تک ہوتا رہا۔

جشن کے اختتام پر یوروپا نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کو کہا ——— ایک خادمہ کی طرح میں اس کے پیچھے چلنے لگی۔ وہ محل کے سب سے زیادہ خوبصورت، شاندار کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے بھی اندر بلا لیا۔ اور تمام خواصوں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ ہم چند لمحے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"ماں! میں تیری یوروپا ہی ہوں۔"

"ہاں یوروپا میری بیٹی" میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر یہ آنسو خوشی کے تھے۔

"تمہیں میری حالت پر حیرت ہوگی؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں خاموش رہی۔ اس نے اپنے سوال کو دہرایا۔

"خدائے رع تمہارا مرتبہ اور بلند کرے"

"تو میری ماں نہیں ہے؟" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں، میں تیری ماں ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یوروپا میں بے حد خوش ہوں کہ میری بیٹی مصر کی ملکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تمہیں خوشی ہے؟" اس نے میرے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

"بہت زیادہ، بھلا میری بیٹی، مصر کی ملکہ بنے، اور مجھے خوشی نہ ہو۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟"

اچانک اس نے دروازے کے پاس کسی کو دیکھا۔

"وہ کیا ہے؟" اس نے ادھر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اٹھی۔ دروازے کے پاس پہنچی۔ وہاں سنگِ مرمر کی ایک چھوٹی سی صندوقچی پڑی تھی۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور یوروپا کے پاس آ گئی۔

یہ تو وہی ہے ——— وہی"۔ یہ کہہ کر اس نے صندوقچی کھولی اس میں چند ریشمی بال تھے، اور ان پر خون کے چند قطرے جم گئے تھے۔ مجھے بوڑھے عموس کا وعدے والا واقعہ یاد آ گیا۔ یہ وعدے کی علامت تھی۔

"وعدے کی علامت؟" اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا "وہ مجھے ۔۔۔۔ یعنی مصر کی ملکہ کو ڈرانا چاہتے ہیں؟"

اس نے صندوقچی دور پھینک دی اور میری طرف مخاطب ہوئی۔

"میں ان ذلیل کتوں کو سخت سزا دوں گی۔ میں مصر کی ملکہ بن کر مصریوں کے خلاف کس طرح جا سکتی ہوں؟"

"درست ہے!" میں نے کہا۔

"اب تم جاؤ؟" اس نے اٹھتے ہوئے کہا: "دیکھو میں تمہاری یوروپا ہوں۔ مجھے اپنی بیٹی ہی سمجھو۔ ملکہ بن کر میں بدل نہیں گئی"۔

میں بہت خوش ہوئی اور آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل کر اپنے کمرے کو چلنے لگی ـــ!

(۶)

یُونانیوں کا قتل

یوروپا ملکہ مصر بن چکی تھی۔ جب وہ شاہی تاج پہنے خواصوں کے ہجوم میں زرنگار کرسی پر بیٹھ کر سر کو مغرورانہ جنبش دے کر اپنے احکام جاری کرتی، تو اس وقت میں خود دھوکا کھا جاتی اور سمجھنے پر مجبور ہو جاتی، کہ یہ یوروپا نہیں ہے، جو ایک سہمے

ہوئے بچے کی طرح ماں ماں کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔ اب اس کی حالت بدل چکی تھی۔ وہ اب دنیا کی سب سے زیادہ شاندار، سب سے بڑھ کر حسین عورت تھی۔ دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ فرعون، اس کا بجان و دل پرستار تھا۔ اپنی خواصوں کے ساتھ وہ مجھے خادمہ سمجھتی، مگر جب کبھی میں خلوت میں اس سے ملتی، وہ مجھے ماں ہی کہہ کر پکارتی۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ میرا بیٹا میرے پاس آیا اور آتے ہی کہنے لگا:۔

"یونانی قتل کیئے جا رہے ہیں!"

"یونانی؟ کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"صحن میں!"

"کیوں؟"

"ملکہ کے حکم سے۔"

میں جلدی سے اٹھی۔ صحن میں پہنچی۔ یوروپا ایک زریں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دو خواصیں اسے شتر مرغ کے پروں کا پنکھا جھل رہی تھیں۔ اس کے پاس ہی مرحوم فرعون کی نورِ نظر، مصر کی سب سے بڑی رقاصہ نفرتتی ایک معمولی خادمہ کی طرح کھڑی تھی۔ ان کے سامنے مصری جلاد بلند قہقہے لگا لگا کر ایک ایک یونانی کو چبوترے پر کھڑا کر کے اس کا سر قلم کر رہے تھے۔ بے شمار سر بلبلوں کی طرح خون میں تیر رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر یونانیوں کی ایک جماعت زنجیروں میں جکڑی ہوئی کھڑی تھی۔ وہیں دیموس، .... وہی پُراسرار بوڑھا جو میں نے کئی بار دیکھا تھا اور جو یوروپا کو لے گیا تھا، کھڑا نظر آرہا تھا۔ فضا میں یونانیوں کی دردناک چیخیں، درد انگیز التجائیں گونج رہی تھیں۔ یوروپا بڑے لطف سے اس خونی منظر کو دیکھ رہی تھی۔ میں خاموشی کے ساتھ یوروپا کے دائیں طرف کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ جلاد برابر اپنا کام کر رہے تھے۔ آہ! اس وقت کا منظر کتنا درد انگیز تھا۔ جب کوئی یونانی چبوترے پر کھڑا کیا جاتا، وہ بلند آواز سے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو جنبش دے دے کر رحم کی التجا کرتا۔ یوروپا قہقہہ لگا کر اپنے ہاتھ کو جنبش دیتی اور اس

کے ساتھ ہی یونانی کا سر کٹ کر خون میں تیرنے لگتا۔ غالباً سرزمینِ مصر میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک عورت ایسے وحشیانہ قتل کا حکم دے رہی تھی اور پھر اس میں دلچسپی لے رہی تھی۔ سر کٹتے گئے۔ یہاں تک کہ دو یونانی باقی رہ گئے۔ اب چبوترے پر بوڑھے ٹموس کو لایا گیا۔

"کیوں یونان کے بوڑھے کتے! کیا اب بھی تجھے یونانیوں کی ہمدردی کا خیال ہے؟"

"ملکۂ مصر........!"

یوروپا نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تو مصری حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانا چاہتا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"نہیں، ملکۂ مصر!"

"نہیں......" وہ ذرا رکی اور پھر کہنے لگی۔ "تجھے شدید سزا دینی چاہیئے۔ مگر میں تجھ پر رحم کھاتی ہوں۔ تجھے جہاز سے پانی میں پھینکا جائے گا، اور تیرا بوڑھا جسم مچھلیوں کی مزیدار خوراک بنے گا۔" وہ پھر خادموں سے مخاطب ہوئی "جاؤ اسے لے جاؤ۔ اور میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

خدّام اسے لے گئے۔ اس کے بعد جلاد چبوترے کی طرف ایک نہایت شکیل، وجیہہ یونانی نوجوان کو لائے۔ خوف کی کوئی علامت اس کے چہرے سے عیاں نہیں تھی۔ وہ چبوترے پر اس طرح بڑھا چلا آرہا تھا۔ گویا ایک فتح مند بہادر اپنے مغلوب دشمن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یوروپا نے حیرت سے اسے دیکھا اور جلّادوں کو اسے پاس لانے کا حکم دیا۔ جلاد اسے ملکۂ مصر کے پاس لائے۔

"تمہارا نام کیا ہے نوجوان؟" یوروپا کا لہجہ بہت حد تک نرم تھا۔

"میرون! یونانی سپاہ کا ایک افسر!"

"تجھے اپنی موت سے ڈر نہیں آتا؟"

"نہیں!"

"تجھے زندہ رہنے کی آرزو ہے تو کہو......"

"اپنے ساتھیوں کو مرتے دیکھ کر زندہ رہنا بزدلی سمجھتا ہوں۔" اس نے ملکہ کے الفاظ

کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیا اب بھی تیرے دل میں اپنے ساتھیوں کی ہمدردی کا خیال ہے؟"

"ہاں! میرے پہلو میں عورت کا دل نہیں ہے۔ جو وعدہ کر کے مکر جائے، اور شان و شوکت حاصل کر کے، اپنے آپ کو، اپنی حیثیت کو اور اپنے فرض کو بھول جائے!"

"جانتے ہو، تم اس وقت کس کے سامنے کھڑے ہو؟" ملکہ نے خشمگیں لہجے میں کہا۔

"اچھی طرح جانتا ہوں، بظاہر ملکۂ مصر اور....."

"اور......؟"

"اور حقیقت میں ایک بزدل، پیمان شکن عورت کے سامنے!!"

یوروپا اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ جلادوں، خواصوں اور خادماؤں پر سناٹا چھا گیا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ چہرہ فرطِ غضب سے سُرخ ہوگیا تھا۔

"یونان کے ذلیل کتے! تجھ میں اتنی جرأت.....؟"

"مگر یونان کا ذلیل کتا ایک پیمان شکن عورت سے بدرجہا بہتر ہے —— ! سمجھو تم کون ہو۔ کس سرزمین نے تجھے پیدا کیا۔ کیا تم نے یونان کی آغوش میں پرورش نہیں پائی؟"

جلادوں نے اسے پکڑ لیا اور اسے گھسیٹ کر پیچھے لے جانے لگے۔

"اسے قید خانے میں لے جاؤ" یوروپا نے جلادوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا "میں اسے دنیا کی شدید ترین سزا دے کر ماروں گی۔"

جلاد اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ اس کے بعد یوروپا اٹھی، اور اپنے خاص کمرے کی طرف چلنے لگی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے تمام خواصوں کو رخصت کر دیا۔

"تمام یونانیوں کو میں نے قتل کرا دیا ہے۔ میرا یہ فعل تمہاری نظر میں درست ہے؟"

اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مصر کی ملکہ بہتر سمجھتی ہے!"

"میں اس وقت تم سے پوچھ رہی ہوں، وہ مصری حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانا

چاہتے تھے میں یونانی ہوں مگر مصری حکومت یا مصریوں کے خلاف کوئی کارروائی یا بغاوت دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتی۔ میں اب مصری ہوں...... مصر کی ملکہ!"

"مگر...... یہ ظلم ہے کہ اتنے یونانیوں کو قتل کروا دیا جائے، اور پھر ان کا کوئی جرم بھی ظاہر نہ ہو"

"اُن کا جرم......؟ ان کا کوئی جرم نہیں؟ تو یہ کیا کہہ رہی ہے آگیلی؟؟"

یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا اور پھر اتنے تلخ لہجے میں!

"مجھے تنہا چھوڑ دو، تمہارا دماغ صحیح بات سمجھنے سے قاصر ہے"

میں اُٹھی، اور حیران و پریشان اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت میرا دل بھر آیا اور میں رونے لگی۔

(۷)

شرط!

رات نصف کے قریب گزر چکی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی، صبح کے واقعے پر غور کر رہی تھی، کہ دروازے پر دستک ہوئی میں اُٹھی، دروازہ کھولا۔ دروازے پر یوروپا کی ایک خاص خادمہ کھڑی تھی۔ میں سمجھ گئی، کہ یوروپا نے بلایا ہے۔ اس لیے ایک لفظ پوچھے بغیر ——— اس کے ساتھ چلنے لگی۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ یوروپا ایک قالین پر بیٹھی ہے اور اس کے چہرے سے فکرمندی ٹپک رہی ہے۔ اس نے پاس بلایا۔ اور خواص کو چلے جانے کے لیے کہا۔

"صبح میں نے تمہیں چند ناخوشگوار فقرے کہے تھے۔ تم اُن سے ناراض تو نہیں ہو گئیں؟"

اس نے مجھے مایوسی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت وہ کس قدر پیاری بھولی بھالی نظر آ رہی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے وہی یوروپا یاد آ گئی، جو مصریوں کے خوف سے ہر وقت ڈرتی رہتی تھی ——— ڈر ڈر کر مجھ سے لپٹ جایا کرتی تھی۔

"نہیں، میں تم سے ناراض نہیں ہوں، ملکۂ مصر!" میں نے جواب دیا۔

"ماں! تم مجھے ملکۂ مصر کیوں کہتی ہو؟ میں تمہاری بیٹی یوروپا ہوں۔ مجھے اسی نام سے پکارو!"

"یوروپا!"

"ہاں، ہاں!"

میں نے مادرانہ شفقت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم غمگین کیوں ہو بیٹی؟"

"ہاں ماں! میں غمگین ہوں!" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے۔

"میں ایک مشکل میں ہوں!"

"کس مشکل میں؟"

"تم نے نہیں سنا ماں!" اس نے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ "فرعون دربار کی ایک رقاصہ کو چاہنے لگا ہے۔ میری آنکھوں نے خود فرعون کو اس رقاصہ سے باتیں کرتے اور اسے اپنے پاس بٹھاتے دیکھا ہے! اس وقت وہ اس کے پاس ہوگی!" وہ پھر ٹھہری اور آہ بھر کر کہنے لگی: "میں کتنی مصیبت میں گرفتار ہوں ماں؟"

اس کا چہرہ بہت غمگین ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے برابر آنسو ٹپک رہے تھے۔

"تمہارا رنج فضول ہے، فرعون تمہارے سوا کسی سے محبت نہیں کر سکتا!"

"مگر میں نے اسے رقاصہ سے محبت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے کئی خواصوں نے بھی آکر بات کہی ہے۔ ماں!"

"خدائے رع تم پر رحم کرے، اتنا غم نہ کرو۔"

"میں عورت ہوں ماں! ایک عورت یہ کیوں کر برداشت کر سکتی ہے کہ اس کا محبت کسی دوسرے کو چاہے ——"

"غم نہ کرو بیٹی! تمہاری یہ مصیبت بہت جلد دور ہو جائے گی!"

"یہ مصیبت دور ہو جائے گی ......؟"

وہ ذرا ٹھہری اور پھر کہنے لگی۔ اس کا لہجہ پر جوش ہو گیا تھا۔

"میری خوشی سے بھری ہوئی زندگی میں غم اور دکھ کا زہر بکھیرنے کے لیے یہ زہریلی ناگن کہاں سے آ گئی؟ صبح کے وقت وہ دربار کی ایک رقاصہ تھی۔ اور میری معمولی سی خادمہ، مگر چند گھنٹوں سے وہ میری خونخوار دشمن بن گئی ہے۔ میں اس کا سر کچل دینا چاہتی ہوں.... اُسے تڑپتے ہوئے ـــــ سسکتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں............

ماں! بتاؤ میں کیا کروں؟؟"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ یوروپا! فرعون تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔"

اس نے مجھے حسرت انگیز نگاہوں سے دیکھا۔ اور اپنا سر میرے زانو پر رکھ دیا۔ آنسو پھر اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"تم پھر رونے لگی بیٹی؟"

"کیا کروں؟ آہ محبت میں عورت کتنی کمزور، کتنی مجبور ہو جاتی ہے؟"

میں اس کے آنسو پونچھنے لگی، اور ساتھ ہی اسے تسلی دینے لگی۔

"اگر فرعون رقاصہ پر مہربان ہو گیا ہے تو تمہیں ہرگز غم نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ رقاصہ آخر رقاصہ ہے اور تم؟ ـــــ مصر کی ملکہ!"

"اگر ایسا ہوتا تو فرعون مجھے چھوڑ کر کیوں ایک ذلیل رقاصہ سے محبت کرنے لگتا؟"

ہاں میں مصر کی ملکہ بننا نہیں چاہتی، میں فرعون کی محبت چاہتی ہوں!"

یہ فقرہ سن کر میں حیران ہو گئی۔ وہ کیا سے کیا بنتی جا رہی تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی

"اس وقت یہاں کون آ سکتا ہے؟" یوروپا نے پوچھا۔

دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہو رہی تھی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے "نفرتتی" کھڑی تھی۔

"میں ملکۂ مصر سے ملنا چاہتی ہوں!" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس سے پیشتر کہ میں اس سے کچھ کہوں، یوروپا نے اس کی آواز سُن کر اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اس وقت اس کی شاہانہ عظمت سخت مجروح تھی

"اس وقت تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟" یوروپا نے اس سے پوچھا

"میں ایک ضروری بات ملکہ سے کہنا چاہتی ہوں" اس نے جواب دیا

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

نفرتتی نے میری طرف دیکھا، اور چپ ہو گئی ..... پھر مجھے چلے جانے کے لیے کہا۔

"نہیں، آگیلی یہیں ٹھہرے گی۔ وہ میری ہمدرد ہے، اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ کہو، کیا بات ہے؟"

"میں یہ کہنے آئی ہوں..... کہ فرعون، رقاصہ آتشی سے محبت ..... میں نے مناسب سمجھا کہ ملکۂ مصر کو یہ بات بتا دوں"

"دیکھا آگیلی!" یوروپا نے مجھ سے مخاطب ہو کر حسرت آلود لہجے میں کہا۔ "یہ بات کس کو معلوم نہیں؟؟"

میں خاموش رہی۔ یوروپا اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"ذلیل رقاصہ...... زہریلی ناگن..... میں اس کا سر کچل دوں گی" اس قسم کے الفاظ اس کے لبوں سے نکل رہے تھے۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ وہ پھر ہمارے پاس بیٹھ گئی۔

"لیکن ملکۂ مصر، میں صرف یہی بات نہیں کہنے آئی" نفرتتی نے کہا۔ یوروپا نے اُسے متعجبانہ دیکھا!

"میں ملکۂ مصر! تم سے ایک چیز مانگنے آئی ہوں" نفرتتی نے کسی قدر جوش میں کہا۔

"صاف صاف کہو، نفرتتی!"

"میں تم سے ایک شخص مانگنے آئی ہوں"

"ایک شخص؟ کون؟" ملکۂ مصر نے خشمگیں لہجے میں کہا

"میں ملکۂ مصر سے یونانی نوجوان "میرون" مانگنے آئی ہوں!"

"کیا کہہ رہی ہے تو خادمہ؟"

"میں خادمہ ہوں . . . . . مصر کی ملکہ! اگر محبت کے راستے میں، ہم دونوں کی ایک ہی حیثیت ہے۔ تم فرعون سے محبت کرتی ہو۔ اس لیے اُسے کسی دوسری عورت سے محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں، مجھے میرون سے محبت ہو گئی ہے، اس لیے میں اُسے موت کے پنجے میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"ایک خادمہ کے کہنے پر، میں ایک گستاخ شخص کی زندگی بخش دوں . . . . . ؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا!"

"ملکہ مصر! یہ بھی دیکھو، تمہیں بھی فرعون سے محبت ہے!"

"میں زیادہ باتیں سننا نہیں چاہتی۔ جاؤ۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ!"

"خدائے رع کے جلال کے لیے مجھے 'میرون' دے دو!"

"اگر تم نے زیادہ اصرار کیا تو اس کے ساتھ تمہیں بھی سخت سزا دی جائے گی!"

یہ سُن کر نفرتتی کانپ اُٹھی

"مجھ پر رحم کرو، ملکہ!"

"میں میرون کا ایک بال بھی تمہیں نہیں دوں گی۔"

"ملکۂ مصر! یہ سن کر کہ فرعون ایک دوسری عورت سے محبت کرنے لگا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ تمہارا محبوب ایک دوسری ہستی کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے، تم کتنی بے قرار ہو گئیں . . . . . . مگر اس عورت کے دل کا اندازہ لگاؤ۔ جس کا محبوب موت کے پنجے میں گرفتار ہے . . . . مجھ پر رحم کرو ملکہ!"

یوروپا ٹہلنے لگی۔ نفرتتی منت سماجت کرتی گئی۔ میں خاموشی سے باری باری اُن دونوں کے چہروں کو دیکھتی رہی۔ یکایک یوروپا کی آنکھیں چمکنے لگیں، اور وہ نفرتتی کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اسے غور سے دیکھ کر کہنے لگی:۔

"میں ایک شرط پر، میرون، تمہیں دے سکتی ہوں۔"

"کس شرط پر، ملکہ؟" نفرتتی نے جلدی سے کہا۔

"تم یہ شرط پوری کرو گی؟"

"کہو ملکہ وہ کون سی شرط ہے، 'میرون' کی جان بچانے کے لیے میں سب کچھ کر سکتی ہوں"
"تمہیں اپنے محبوب کی جان بچانے کے لیے ایک ہستی کا خاتمہ کرنا ہو گا!"
"ملکہ!"
"تمہیں کسی نہ کسی طرح اس ذلیل رقاصہ کو ہلاک کر دینا ہو گا..... !"
مجھے اُمید تھی کہ یوروپا نفرتتی سے یہی شرط کہے گی!
"رقاصہ کو..... فرعون کی..... ؟"
"بس، بس! میں آگے سننا نہیں چاہتی۔ یہ شرط پوری کرنے پر تیار ہو؟"
"میں یہ شرط پوری کروں گی، ملکہ!"
جب میں رقاصہ کی نعش دیکھ لوں گی۔ تو 'میرون' آزاد کر کے تمہیں دے دوں گی۔
اس وقت تک وہ قید میں رہے گا۔"
"ملکۂ مصر!"
"مجھ پر اعتبار کرو، نفرتتی! کیا تم وعدہ کرتی ہو۔ کہ اس شرط کو بہت جلد پورا کرو گی؟"
نفرتتی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور ساتھ ہی اپنے سر کے چند بال نوچ کر یوروپا کو دے
دیئے۔ یوروپا نے بھی اپنے سر کے چند بال پیش کر دیئے۔
"دیکھو اپنا وعدہ بھول نہ جانا۔ 'میرون' کی زندگی تمہارے وعدے کی تکمیل پر منحصر ہے۔"
"میں اپنے محبوب کی جان بچانے کے لیے یہ شرط ضرور پوری کروں گی۔"
"جاؤ، اب چلی جاؤ!" ملکہ نے کہا
"کل شام تک میں یہ شرط پوری کر دوں گی۔"
"یہ کہہ کر وہ اُٹھی، اور کمرے سے خاموشی کے ساتھ نکل گئی۔
اس کے جانے کے بعد یوروپا نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی چھائی ہوئی تھی۔
"یہ عجیب واقعہ ہے؟" میں نے کہا۔
"ہاں، ہاں! محبت میں عورت کیا کچھ نہیں کرتی؟" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے
دو شفاف قطرے نکلے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں نیند آنے لگی۔ جب وہ سو گئی

تو میں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

(۸)

خزانے کی تلاش!

رقاصہ مسموم شراب پلا کر مار ڈالی گئی۔ پورو پا نے حسبِ وعدہ یونانی نوجوان میرون کو آزاد کر دیا۔ رقاصہ کی موت کے بعد یوروپا کے راستے میں کوئی بھی حائل نہ تھا۔ فرعون اُسے پہلے سے بھی زیادہ چاہنے لگا۔ اور ملکۂ مصر کو وہ عظمت و اقتدار حاصل تھا، جو آج تک کسی عورت کو بھی حاصل نہ ہو سکا تھا۔ اپنی شان و شوکت کی نمائش کی غرض سے، وہ انتہائی طور پر فضول خرچ ہو گئی تھی۔ شاہی خزانہ مسلسل اس کی آرائشوں اور زیبائشوں پر صرف ہو رہا تھا۔

رقاصہ کو مرے ہوئے بیس دن گذر چکے تھے۔ ان بیس دنوں میں اس نے متعدد جشن کئے جن میں ملکہ نے ہیروں اور موتیوں کو پتھر کے معمولی ٹکڑے سمجھ کر اپنے خادموں میں لٹایا۔ خزانے کا بہت بڑا حصّہ ان فضول خرچیوں میں ختم ہو گیا۔ مگر یوروپا کی بے احتیاطی برابر بڑھ رہی تھی، اور دولت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے کہتی۔ "میں نے سُنا ہے کہ یہاں کے کھنڈروں میں خزانہ دفن ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مصری اپنے حکمرانوں کے تابوتوں میں دولت بھی رکھ دیتے ہیں۔ مجھے دولت کی سخت ضرورت ہے کیا تم میری مدد کرو گی؟"

"نہیں، ملکۂ مصر! ایسا نہیں ہو سکتا"

"کیوں؟ وہ غصّے سے کہتی۔

"کھنڈروں کا تو مجھے پتہ نہیں ہے، اور تابوتوں سے ہم خزانہ کسی صورت میں بھی نہیں نکال سکتے۔ کیوں کہ یہاں مُردوں کے احترام کو مجروح کرنا، بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس جرم کو خدائے رع کبھی معاف نہیں کر سکتا" یہ سن کر وہ مجھ سے خفا ہو کر چلی جاتی۔

ایک چاندنی رات کو ہمارا جہاز مادرِ نیل کی آغوش میں آہستہ آہستہ رواں تھا۔ یوروپا پازرنگار کرسی پر متمکن تھی۔ اس کے پہلو میں نہایت قیمتی چمکتے ہوئے موتیوں کا ہجوم بکھرا پڑا تھا۔ اور اس کے سامنے بے شمار حبشی خدام، پرامید نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یوروپا ایک خاص شان سے شراب کا ایک گھونٹ پیتی، اور گھونٹ پی کر موتیوں کو بے دردی سے ہوا میں پھینک دیتی۔ حبشی انھیں حاصل کرنے کے واسطے دامن پھیلا کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگتے۔ اور اسی کوشش میں ان میں سے چند پانی میں گر پڑتے یوروپا قہقہہ لگاتی اور پھر موتیوں کو پھینکتی۔ یہ ہولناک درد انگیز منظر اس کے واسطے بہت دلچسپ کھیل تھا۔ موتیوں کی کثیر تعداد پانی میں گر رہی تھی اور ان کے ساتھ متعدد حبشی بھی اپنی جانیں ضائع کر رہے تھے ...... کافی دیر تک یہ کھیل جاری رہا۔ آخر جب موتی ختم ہو گئے تو یوروپا کے چہرے پر خفگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اپنا دلچسپ کھیل جاری رکھنے کے لیے اب اس کے پاس سامان نہیں تھا۔ اس نے شراب کے زرّیں ساغروں کو جہاز سے نیچے پھینک دیا اور باقی ظروف بے پروائی کے ساتھ پاؤں سے ٹھکراتی ہوئی خلوت میں چلی گئی۔ میں ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ مظلوم حبشی غوطے کھا کھا کر اپنی جان بچانے کے لیے جہاز کے تختے کو پکڑ لیتے تھے۔ ملّاح ان کی حالتِ زار دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے اور چپوؤں سے ان کے سروں پر ضربیں لگا رہے تھے۔ کہ ایک طرف سے غضبناک آواز سنائی دی:-

"خاموش کتّو!"

میں نے دیکھا کہ یوروپا ایک طرف پردہ ہٹا کر، خشمگیں نظروں سے ملّاحوں اور خادموں کو دیکھ رہی ہے۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ یوروپا پھر اندر چلی گئی۔ جانے سے پیشتر اس نے مجھے دیکھا مگر بے پروائی سے۔ یہی وہ یوروپا تھی، جو کبھی میرے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اور یہی یوروپا تھی جسے میری ذرہ بھر بھی پروا نہیں تھی۔

چاند ہمارے جہاز کے عین اوپر چمک رہا تھا۔ پانی میں غرق ہوتے ہوئے حبشیوں کی دردناک چیخیں سکوت کو زخمی کر رہی تھیں۔ میں کافی دیر تک دریا کے مناظر کو دیکھتی اور ملّاحوں کی گفتگو سنتی رہی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اسی دوران میں میری آنکھ لگ

گئی ۔ اچانک میری پُشت پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میری آنکھ کھل گئی ۔ یورروپا میرے پاس کھڑی تھی ۔ اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے سُرخ تھا !

" چلو میرے ساتھ ...... "

میں گھبرا کر اُٹھی اور اس کے ساتھ ایک طرف گئی ۔ وہاں نفرتتی بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس کے سوا وہاں کوئی بھی نہیں تھا ۔ یورروپا نے نفرتتی کو چلے جانے کا حکم دیا ۔ اور خود میرے پاس بیٹھ گئی ۔

" تم نے مجھے کچھ پتہ نہ بتایا مگر میں نے آخر معلوم کر ہی لیا نا ! "

" کیا ؟ "

" خزانہ ...... ! "

" خزانہ ؟ " میں نے حیرت سے پوچھا ——— کہاں ؟

" یہ میں نہیں بتا سکتی ! "

" میں نے تمہاری بات سمجھی نہیں ! "

یورروپا بے حد خوش تھی ۔ میں اسے حیرت سے دیکھنے لگی ۔

" ماں تمہیں معلوم نہیں ہے ۔ خزانے کا پتہ کس نے بتایا ہے ؟ "

" نہیں یورروپا ! "

" میں تمہیں بتاتی ہوں ۔ نفرتتی نے اس احسان کے بدلے ، ایک ایسے خزانے کا پتہ بتایا ہے جو میری زندگی میں کبھی بھی ختم نہ ہو گا ۔ "

" مگر ...... یورروپا ! "

" نہیں ، میں کچھ بھی سُننا نہیں چاہتی ۔ اس نے میرے الفاظ کاٹ کر کہا مجھے نفرتتی پر پُورا بھروسہ ہے ۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی ۔ اگر خزانہ نہ نکلا تو میں اسے اور میر دن کو فوراً قتل کرا دوں گی ۔ "

" خدائے رع کے ...... "

" اس وقت میں اور کچھ نہیں سُننا چاہتی ...... مجھے دولت کی از حد ضرورت ہے ۔

کل رات کو میں، نفرتتی اور تم ہم تینوں چلیں گے"۔

"کہاں؟"

"کہاں؟...... جہاں وہ لے جائے گی!"

"میں تم سے بڑھ کر اسے جانتی ہوں بیٹی!" میں نے اسے نرمی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ کھنڈروں میں کوئی خزانہ نہیں ہے اور تابوتوں سے ہم......... کسی صورت بھی دولت نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتے!"

"کل تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے!" اس نے غضب ناک لہجے میں کہا میں خاموش ہوگئی۔

"میں چاہتی ہوں۔ کہ میرے ساتھ کوئی مرد بھی جائے...... ایک ایسا مرد جس پر میں بھروسہ کر سکوں کہ وہ راز کو پردۂ اخفا میں رکھے گا!"

"ایسا مرد کون ہو سکتا ہے؟"

"خادموں پر مجھے اعتبار نہیں!"

آخر یہ بات طے ہوئی کہ میں اپنے بیٹے 'زاعموت' کو ہمراہ چلنے کے لیے کہوں دوسرے دن صبح میں 'زاعموت' کو لے کر ملکہ کی خدمت میں حاضر ہوگئی۔

"دیکھو، کسی کو اس کے متعلق خبر نہ ہو" ملکہ نے زاعموت سے کہا۔

"خدائے رع کی قسم! میں اپنا وعدہ پورا کروں گا!"

قسم کھانے کے بعد میں اور میرا بیٹا وہاں سے واپس آگئے۔

(۹)

ایک تحیّر زا واقعہ!

جب رات کی تاریکی پھیل گئی۔ تو میں، نفرتتی، یوروپا اور زاعموت محل سے نکلے نفرتتی ہماری راہنمائی کرنے لگی۔ اس نے ہاتھ میں شمع دان پکڑا ہوا تھا اور زاعموت کے ہاتھ میں کدال تھا۔ ہم خاموشی کے ساتھ چلنے لگے۔ ہر طرف خاموشی مسلط تھی۔ کافی فاصلہ

طے کرنے کے بعد ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ ملّاح گیت گاتے ہوئے کشتی کھینے لگے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ ان کی کشتی میں کون سوار ہیں۔

آخر کار ہماری کشتی کنارے آ لگی۔ ساحل کے پاس درختوں کے مہیب سائے رینگتے ہوئے سانپوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ پانی میں ستاروں کے عکس ربّۃ آئی سیز کے تاج کے موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔

ہم کشتی سے اترے۔ نفرتیتی ہمارے آگے آگے چلنے لگی ـــــ چاروں طرف ہیبت زدہ اور وحشت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں یوروپا کے پہلو بہ پہلو چل رہی تھی۔ اس کا چہرہ مسرت افزا تصورات کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ اس کے برخلاف جب میں آگے بڑھ کر، نفرتیتی کے چہرے کو دیکھتی تھی تو وہ فکرمند نظر آتا تھا ـــ وہ چلتے ہوئے بار بار ٹھہر جاتی تھی۔ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھتی تھی اور پھر چلنے لگتی تھی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم "معبد بیرنط" کے پاس پہنچ گئے۔ نفرتیتی رک گئی۔

"اب ہماری منزلِ مقصود قریب آگئی ہے۔ اس کے لبوں سے نکلا۔

"تو جلدی چلو"۔ یوروپا نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا

نفرتیتی نے اپنا رُخ معبد کے دائیں پہلو کی طرف کیا اور چلنے لگی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں ایک بڑا سا تودہ نظر آیا۔ نفرتیتی تیزی سے اس کے اوپر چڑھنے لگی۔ اور ہماری نظروں سے غائب ہوگئی۔ ہم بھی آہستہ آہستہ چڑھنے لگے۔ شمعدان نفرتیتی کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے تاریکی میں ہمیں کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے بعد وہ نیچے اتری۔ اور خاموشی سے ایک طرف کو قدم اٹھانے لگی۔ ہم بھی اس کے پیچھے قدم اٹھا رہے تھے۔ ہمارے آس پاس درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ معبد بیرنط، کی چوٹی اب نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ یکایک 'نفرتیتی' ایک جگہ ٹھہر گئی۔

"ہم اپنی منزلِ پر پہنچ گئے ہیں کیا؟" یوروپا نے مضطربانہ کہا

"ہاں، ملکہ مصر!" یہ کہہ کر وہ چند ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں کے اوپر چڑھنے لگی۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر ہمیں ایک فراخ جگہ مل گئی۔ اس جگہ کو طے کرنے کے بعد پھر سیڑھیاں تھیں۔ ہم ان

سے نیچے اترے۔ اور ایک شکستہ دروازے میں سے گزرنے لگے۔ ہمارے دونوں طرف سنگِ سماخ کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں کھڑی تھیں۔ چند قدم طے کرنے کے بعد نفرتتی نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا:

"اب ہم اصلی جگہ پر پہنچ گئے ہیں۔"

آگے پھر سیڑھیاں تھیں۔ ان سے نیچے اترنے کے بعد ہم نے خود کو چھوٹے سے کمرے میں پایا۔ میں نے مدھم روشنی میں دیکھا کہ ہمارے اِردگِرد لکڑی کے بڑے بڑے صندوق پڑے ہیں۔ میں نے ایک صندوق کھولا۔ اس میں ایک حنوط شدہ لاش تھی۔ میں نے اسے جلدی سے بند کر دیا۔ اس وقت ہم قبرستان کے نچلے حصّے سے گزر رہے تھے۔ خوف وہراس میرے دِل پر طاری تھا۔ میرا بہادر بیٹا بھی ڈر رہا تھا۔ میں یوروپا کے چہرے کو نہ دیکھ سکی۔ کیونکہ وہ نفرتتی کے ساتھ چل رہی تھی۔ یکایک اپنے سامنے ایک شگاف میں مجھے مدھم سی روشنی دکھائی دی۔ اور یہ دیکھ کر میں سخت متعجب ہوئی کہ نفرتتی اسی شگاف کی طرف جارہی ہے۔ اس کے قریب جاکر معلوم ہوا کہ وہ چھوٹا سا دروازہ ہے۔ نفرتتی نے ہاتھ بڑھا کر شمع دان کو دروازے کے باہر رکھ دیا اور خود وہاں سے گزر گئی۔ یکے بعد دیگرے ہمیں بھی وہاں سے گزرنا پڑا۔ وہاں پہنچ کر اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ نہ تو وہاں نفرتتی ہے نہ شمعدان پتھر کی ایک چٹان کے اوپر دو تین چراغ جل رہے تھے۔ میں نے یوروپا کا ہاتھ پکڑا اور چراغوں کی طرف چلنے لگی۔ ابھی ہم اس کے قریب بھی نہ پہنچے تھے کہ ہمارے کانوں میں نفرت انگیز قہقہوں کی آواز آئی۔ ہم ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔

"آگے آجاؤ!" وہیں سے تحکمانہ لہجے میں آواز آئی۔

ہم حیران وششدر آگے بڑھے اور یکایک میں لرز گئی۔ بوڑھا علوس چٹان پر بیٹھا ہوا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے پاس نفرتتی اور میرون کھڑے تھے۔ ایک طرف چند یونانی ہاتھ میں خنجر پکڑے اس طرح کھڑے تھے، گویا ابھی ہم پر حملہ کر دیں گے!

"میرون! انھیں میرے احکام کے مطابق جکڑ لو۔ اس نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو دو مضبوط ہاتھوں میں پایا۔ پھر کسی نے مجھے دھکیل دیا۔ میں

دھم سے نیچے گر پڑی۔ بدن پر چوٹیں آئیں اور مجھے اپنا بدن چکنا چور ہوتا ہوُا محسوس ہوا۔ وہاں اتنی تاریکی تھی کہ مجھے اپنے پاس کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں نے ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ پتھروں کے ٹکڑے اور مٹی مجھے اپنے گرد پھیلی ہوئی محسوس ہوئی۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر تک وہاں پڑی رہی۔ شدید ضربات نے مجھے بے دم کر رکھا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر میں یونہی گرفتار اور بند رہی تو یقیناً مر جاؤں گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے غار کے چپے چپے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ اس وقت مجھے اپنی اتنی فکر نہیں تھی جتنی یوروپا کی . . . . . میری بیٹی یوروپا! اسی اثنا میں میرا ہاتھ ایک شگاف میں جا پڑا۔ اس کی مٹی خود بخود گرتی جا رہی تھی، اس لیۓ مجھے اس کے کشادہ کرنے میں زیادہ تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ جب یہ کافی کشادہ ہو گیا۔ تو میں اس سے دوسری طرف گئی۔ وہاں مجھے سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ میں نے اسے ہلانے کی کوشش کی وہ اٹھنے لگی۔ میں نے قدم اٹھائے۔ یکایک دھم سے میں پھر گر پڑی۔ ہاتھوں نے اپنے آس پاس کی چیزوں کو ٹٹولنا شروع کیا میرا ہاتھ ایک انسانی جسم پر پڑا۔ تاریکی اس قدر تھی کہ کچھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔ میرا ہاتھ ایک چہرے کو مَس کر رہا تھا۔ اچانک میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں ایک تابوت کے اندر گر پڑی ہوں۔ یکلخت کانپ اٹھی ـــــ لرز اٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر ڈھکنا اٹھایا ـــــ باہر نکلی اور پھر آگے بڑھی ـــــ چند قدم طے کرنے کے بعد، میں پھر لاشوں کے درمیان گر پڑی خوف و دہشت سے میرا دم نکلا جاتا تھا۔ میں آگے بڑھتی گئی ایک جگہ پہنچ کر مجھے مدھم سی روشنی نظر آئی ـــــ تیزی سے اس طرف پہنچی۔ وہاں ایک شگاف تھا۔ کافی کشادہ، میں بآسانی اس میں سے گزر گئی۔ میرے ساتھ ساتھ دیوار جا رہی تھی اور دائیں طرف چند قدموں پر مٹی کے ایک تودے پر چراغ جل رہے تھے۔ ان کے پاس بوڑھا 'عموس' بیٹھا تھا۔ پاس 'میرون' تھا ـــــ اور چند ایک یونانی بھی نظر آ رہے تھے۔ مگر چونکہ تاریکی تھی۔ اس لیے انھیں اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یوروپا بوڑھے عموس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار نمایاں تھے۔

"کیوں ملکہ؟ آخر تو ہمارے جال میں پھنس گئی نا؟" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

یورو پا خاموش کھڑی تھی۔

"تو سمجھتی تھی کہ عموس جہاز سے گر کر مر گیا ہوگا...... مگر میں زندہ ہوں، تجھے دنیا کی شدید ترین سزا دینے کے لیے زندہ ہوں، تو نے ہمیں دھوکا دیا۔ ہمارے بھائیوں کو تیغ کے گھاٹ اتار دیا۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ تیری تکا بوٹی کر دوں۔"

اس کے لمبے لمبے ہاتھ اس کے سینے کے پاس فرطِ غضب سے لرزنے لگے۔

"بتا اب کیا چاہتی ہے۔ فاقوں سے تڑپ تڑپ کر جان دینا یا...... ابھی۔"

"عموس!" یوروپا نے بلند آواز سے کہا۔

"کہو، کیا کہنا چاہتی ہو۔ اس وقت تم مصر کے شاہی محل میں نہیں ہو...... اپنی حالت کا اندازہ لگاؤ، میرے ایک اشارے سے تمہارے جسم کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں مگر میں تمہیں سزائیں دے کر مارنا چاہتا ہوں۔ ایک غدار، پیمان شکن عورت کو سخت سزائیں دیکر مارنا چاہیئے۔ اس وقت تم "نفرتتی" پر لعنتیں بھیج رہی ہو گی...... کہ اس نے تم سے دغا کی مگر یہ بھی سمجھو تم کون ہو۔ اس نے مصری عورت ہو کر یونانیوں کی مدد کی اور تم نے یونانی ہو کر اپنے بھائی یونانیوں کو سخت بے رحمی کے ساتھ اپنے سامنے ہی قتل کروا دیا۔ بتاؤ تم میں سے زیادہ ذلیل اور زیادہ دغا باز کون ہے؟...... پیمان شکن عورت! اب تو تڑپ تڑپ کر یہاں جان دے گی۔ تمہارے ساتھی بھی یہیں مریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور یوروپا کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہاتھوں کو پکڑا، اور بلند آواز میں کہنے لگا۔

"بتاؤ تم یونانی نہیں ہو۔ یونان کی سرزمین نے تمہیں زندگی نہیں بخشی؟ زیوس تجھے ابدی عذاب میں مبتلا کرے۔ تم نے اپنے بھائیوں کو قتل کروا کر خوشی محسوس کی۔"

"عموس!" یوروپا نے دوبارہ کہا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"میں اب بھی تجھے آزاد کر سکتا ہوں۔ تیری زندگی بچا سکتا ہوں۔ مگر ایک شرط پر۔ بتاؤ اس شرط کو پورا کرو گی؟"

یوروپا خاموش رہی۔

"تمہیں ...... تمہیں فرعون کو زہر دے دینا ہوگا ـــــ اس کی موت کے بعد بھی تم ملکۂ مصر رہو گی۔ پھر ہمیں مصریوں سے بڑھ کر دولت و مرتبہ دینا ہوگا ... بولو یہ شرط منظور ہے؟"

"فرعون کو زہر؟"

"ہاں یوروپا ـــــ میری بیٹی، مصر کی ملکہ! تجھے یہی کرنا ہوگا۔ ہزاروں یونانیوں کو بے رحمانہ قتل کیا گیا ہے۔ ان کے خون کے ہر قطرے کا یہی مطالبہ ہے۔ تم یونانی ہو، ملکۂ مصر کا عزور تجھ سے تیرا یہ حق نہیں چھین سکتا۔ بولو جواب دو؟"

یوروپا خاموش رہی۔

"تمہیں یہ شرط منظور ہے!" عموس نے یہ کہتے ہوئے، اس کی پیشانی پر خنجر سے زخم لگایا۔ اس میں سے خون بہنے لگا۔ میں ڈر گئی کہ یہ ظالم کیا کرنے لگا ہے۔

اس کے اوپر اپنے دونوں ہاتھ رکھو اور خدائے زیوس کے جلال کی قسم کھا کر وعدہ کرو کہ تم ہماری شرط پوری کرو گی"

میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب یوروپا نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا۔

"اب تم آزاد ہو اور ابھی محل میں پہنچ جاؤ گی!"

عموس کے حکم سے میرون، نے ایک طرف سے بڑا سا پتھر ہٹا دیا۔ عموس نے یوروپا کا ہاتھ پکڑا۔ اور وہاں سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باقی یونانی بھی باہر چلے گئے۔ میرے سامنے باہر نکلنے کا راستہ موجود تھا۔ مگر میں نہیں نکل سکتی تھی۔ ایک تو مجھے اپنے بیٹے زاعموت کی فکر تھی۔ اور دوسرے مجھے یہ بھی خوف تھا کہ جونہی میں باہر نکلی وہ مجھے پھر گرفتار کر لیں گے۔

اچانک پاس ہی ایک شگاف نظر آیا۔ میں نے چراغ اٹھا کے اس کے اندر دیکھا۔ زاعموت ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا اور اسے شگاف میں سے نکل کر اپنے پاس آنے کے لیے کہا۔ جب وہ پاس آگیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے رخسار سے خون بہہ رہا ہے۔ سر کے بال بھی خون میں شرابور ہیں مگر اس وقت کیا ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو ہمیں رہائی حاصل کرنا تھی۔

"ماں! اب ہمیں یہیں مرنا ہوگا۔ ملکۂ مصر کہاں ہے؟"

"وہ ...... چلی گئی!"

"چلی گئی، کہاں؟"

"وہ یہاں سے نکل گئی ہے ـــــ مجھے بھی راستہ معلوم ہے۔"

"تو ہم کیوں نہ نکلیں۔"

"باہر یونانی کھڑے ہیں۔"

"کوئی پروا نہیں۔" زاعموت نے پُرجوش آواز میں کہا۔

ہم اسی راہ سے باہر نکلے۔ باہر کامل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں ستارے چمک رہے تھے۔ ہمیں کوئی یونانی نہ ملا۔ چنانچہ تیزی سے قدم اٹھانے لگے۔ بہ ہزار دقت ساحلِ نیل پر پہنچ گئے۔ اب محل تک جانا آسان تھا۔

(۱۰)

فرعون کو زہر دیا جاتا ہے ـــــ!

جب ہم محل میں پہنچے تو صبح کی روشنی بتدریج پھیل رہی تھی۔ میرا دل یورو پا سے ملنے کے لیے بیتاب تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے زاعموت کے زخموں پر کپڑا باندھ دیا۔ وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد سو گیا۔ میرے جسم کے ہر عضو میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ دماغ سوچنے سے قاصر تھا۔ میں لیٹنے کو تو لیٹ گئی مگر نیند کہاں؟ آخر جب سورج کی کرنیں کھڑکیوں سے داخل ہو کر میری آنکھوں میں چبھنے لگیں۔ تو میں اٹھی اور یوروپا کو تلاش کرنے لگی۔ ابھی اس کی تلاش میں سرگرداں تھی کہ میرے کانوں میں قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ میرے پاس چند خواصیں کھڑی ہوئی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ ایک طرف چلی گئیں۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھی قہقہوں کی آواز پھر میرے کانوں میں آئی۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد میں نے دیکھا کہ فرعون تخت پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے سامنے یوروپا سنگِ مرمر کے ایک چبوترے کے ساتھ کھڑی ہے۔ چبوترے پر شراب سے بھرے ہوئے ساغر رکھے ہوئے ہیں۔ یوروپا نے پاؤں میں سنہری چپلیں پہنی ہوئی تھیں۔ اور اس

کا جسم نیم عریاں تھا۔ فرعون اسے مسحورانہ دیکھ رہا تھا۔ اور وہ تمام قاتل اداؤں سے اسے مغلوب کر رہی تھی۔ میں دیوار سے لگ کر یہ منظر دیکھنے لگی۔

یوروپا نے ایک سنہری صندوقچے سے دو چمکتے ہوئے موتی نکالے اور انھیں ساغر میں ڈال دیا۔ وہ ساغر فرعون کی طرف بڑھایا اس نے چند گھونٹوں میں اسے ختم کر کے ساغر کو پرے پھینک دیا۔ اس کے بعد یوروپا نے دو موتی نکالے اور انھیں بھی ساغر میں ڈال کر خود پی لیا۔

"میں ایک چیز کی کمی محسوس کر رہی ہوں!" یوروپا نے قہقہہ لگایا اور ایک خاص انداز سے فرعون کو دیکھنے لگی۔

"کون سی چیز؟ کیا دنیا میں کوئی چیز ہے جو فرعون تمہیں نہیں دے سکتا؟"

"مجھے ایک چیز کی ضرورت ہے!"

"کہو وہ کیا چیز ہے؟"

"وہ چیز" یوروپا نے چند اور موتی نکالے اور انھیں ساغر میں ڈال کر پی گئی۔

"تم سمجھتے ہو کہ مصر میں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کی جا سکتی؟"

"ہاں!" فرعون نے اٹھ کر کہا "فرعون کی عظمت و قوت کے سائے میں رہ کر ایسا نہیں ہو سکتا یہ فرعون کے اقتدار کی توہین ہے!"

"جہاں تک دولت کا تعلق ہے، یونان مصر پر فوقیت رکھتا ہے" یوروپا نے پھر قہقہہ لگایا۔

"یونان؟ چند دنوں کے بعد یونان کی تمام دولت تم اپنے قدموں پر بکھری ہوئی پاؤ گی"

"ایسا ہو سکتا ہے؟"

"فرعون کی طاقت ایسا کر سکتی ہے!"

"مجھے دولت کی سخت ضرورت ہے"

"چند دن تک دنیا کی تمام دولت حاصل ہو جائے گی"

"یوروپا نے ایک اور ساغر اٹھایا اور اسے یوروپا کے ہاتھوں میں دے دیا۔

"فرعون کی محبوبہ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کر سکتی" اس نے محبت انگیز نظروں سے یورو پا کو دیکھتے ہوئے کہا، اور ساغر کو منہ سے لگا لیا۔ اچانک یوروپا کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ آنکھوں سے وحشت برسنے لگی، وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ساغر کو فرعون کے منہ سے ہٹا کر ایک طرف پھینک دیا۔ فرعون حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں نے اس ...... کوئی موتی نہیں ڈالا تھا، یوروپا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہو!" فرعون نے قہقہہ لگایا...... مگر تم کانپ کیوں رہی ہو۔ تمہارے چہرے کا رنگ زرد کیوں ہو گیا ہے ؟"

میرے چہرے کا رنگ زرد ہے، واقعی ؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ صاف طور پر مصنوعی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے چند موتی ایک ساغر میں ڈالے اور اسے فرعون کی طرف بڑھایا۔ فرعون نے اسے ختم کر کے 'یوروپا' کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

"یونانی عورت!" یکایک مجھے قریب سے بہت آہستہ آواز سنائی دی۔

یوروپا تڑپ اٹھی، میرے پاس آکر دیکھنے لگی۔ میں دیوار سے لگ گئی۔

"ذلیل بوڑھے"! یوروپا نے بلند آواز میں کہا۔ فرعون بھی اٹھ بیٹھا۔ اور میرے پاس ہی سے عموس کو گھسیٹتے ہوئے تخت کے پاس لے گیا۔ ابھی تک ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ "تم کون ہو ؟" فرعون نے گرجتے ہوئے کہا۔

"یوروپا!" یونانی عورت! تمہارا وعدہ" عموس نے یوروپا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس خبیث بوڑھے کو دیکھنا نہیں چاہتی" یوروپا نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

فرعون نے عموس کی گردن پکڑ کر اسے زمین پر گرا دیا۔ اور بلند آواز سے خادموں کو بلایا۔ چند خادم وہاں آگئے۔ فرعون کے اشارے سے انہوں نے عموس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ یوروپا وہاں کھڑی رہی اور اس ہولناک منظر کو نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھتی رہی۔

جب خادم چلے گئے تو اس نے فرعون کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میرا بیٹا انتظار کر رہا تھا۔

"اے معبد رع کے محافظ! میں نے تمام واقعات سنا دیئے ہیں۔ میں نہیں جانتی آگے

کیا ہو گا؟ (یہاں پہنچ کر آگیلی کا بیان ختم کیا جاتا ہے. آگے کا بیان اس کے بیٹے زائموت کی زبانی ہے)

(۱۱)

دردناک انجام!

اے معبدِ رع کے محافظ! چونکہ میری ماں نے تجھ پر اعتبار کیا تھا اور تیری خواہش پوری کی تھی، اس لیے میں بھی تیری آرزو کو پورا کروں گا اور تجھے آخری واقعہ بھی سُنا دوں گا۔ فرعون کو زہر دیا گیا تھا، مگر کم مقدار میں، اور اس وقت اس پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ یوروپا نے زہر آلود شراب کا ساغر اس کے لبوں سے ہٹا لیا تھا، جس صبح یہ ہولناک واقعہ پیش آیا، اس کے چند دن بعد ایک رات محل کے صحن میں عظیم الشان جشن منعقد تھا. میں فرعون کے پاس کھڑا تھا۔ یکایک اس کا سر چکرانے لگا اور جشن سے باہر نکل گیا، یوروپا کو اس کی عدم موجودگی کی خبر نہ ہوئی جشن ہوتا رہا اور جونہی یوروپا کو خبر ہوئی کہ فرعون جشن سے باہر چلا گیا ہے۔ اس نے جشن بند کرنے کا حکم دیا اور صحن سے باہر نکل آئی، میں اور میری ماں بھی اس کے ساتھ تھے۔

فرعون کے سر چکرانے کی خبر سن کر، وہ بہت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ راستے میں ہمیں ایک خادمہ ملی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ فرعون تہ خانے کی طرف گیا ہے، ہم تینوں تیزی سے تہ خانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ فرعون بلند آواز سے "یوروپا یوروپا" پکار رہا ہے۔ یوروپا تیزی سے اس کے پاس پہنچی، اور اس سے لپٹ گئی۔

"فرعون.......فرعون!! میں یہاں ہوں!" اس کے لبوں سے نکلا۔

یکایک ہمارے پیچھے سے میروں، اور دو یونانی ہاتھوں میں خنجر لئے ہوئے اُن کی طرف جھپٹے، میں بعجلت فرعون اور یوروپا کے آگے کھڑا ہو گیا۔ تیزی سے ایک یونانی کے ہاتھ سے خنجر چھین کر، وہی خنجر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میں اکیلا تھا اور وہ دو۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ ان کے واروں کو بچاتا رہا۔ آخر دوسرا یونانی بھی

گر پڑا۔ میروں نے پورے جوش اور زور کے ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ میرے بازو پر کاری زخم آیا۔ میں نے تیزی سے اس پر وار کیا۔ میرا خنجر اس کے سینے کی طرف جا رہا تھا کہ ایک دم نفرتتی درمیان میں آگئی۔ اور خنجر اس کی پشت پر لگا۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر گر پڑی اپنی محبوبہ کو مرتے دیکھ کر میروں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا۔ آخر اس کے سینے پر ایسا زخم لگا، کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اور اس کے ساتھ میں بھی زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑا۔ میری ماں، میری طرف بڑھنے لگی۔ مگر یوروپا کی چیخ سن کر رک گئی۔ فرعون گر پڑا تھا، اور تڑپ رہا تھا۔ میں نیم بیہوشی کی حالت میں کھڑا تھا اور خون برابر میرے زخموں سے بہہ رہا تھا۔ مگر میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کی آوازیں بھی میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

"مجھے زہر دیا گیا ہے!" فرعون نے تڑپتے ہوئے کہا۔

"فرعون! فرعون!!" کہتی ہوئی یوروپا اس سے لپٹ گئی۔ فرعون کے حلق سے ہلکی سی آواز نکلی مگر میں وہ آواز سن نہ سکا اور وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ——!

"میرے محبوب! میرے فرعون!!" یوروپا چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ میری ماں نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔

"میرا بیٹا بھی مر چکا ہے بیٹی!" میری ماں نے غمگین آواز میں کہا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر فرطِ ضعف سے ایسا نہ کر سکا۔

"اب زندگی بے کار ہے ...... آہ فرعون کو زہر میں نے دیا تھا .... ماں! میں نے خود پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ ان ذلیل یونانیوں کا کہنا مان لیا۔ اب میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

"میری زندگی بھی بیکار ہے!" میری ماں نے کہا۔ یکلخت اس کی نظر گوشے میں کسی چیز پر پڑی۔ وہ یوروپا کا ہاتھ پکڑ کر اس کی طرف لے گئی۔ میں لیٹے لیٹے بصد مشکل ذرا آگے بڑھا۔ اب میں اس قدر نڈھال ہو گیا تھا کہ جسم کو ذرا بھر جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ میری ماں نے جھک کر کسی چیز کو اٹھا لیا۔

"ہمارا زندہ رہنا بے سود ہے!"

"ہاں، ماں!"

" جانتی ہو، اس میں کیا ہے ؟" میری ماں نے اس سے پوچھا۔

" ہاں ..... میں جانتی ہوں ..... مجھے .... مجھے سب کچھ یاد آگیا ہے"

یورردپا، خاموش ہوگئی

" یورردپا، میری بیٹی

" ماں ! .... ماں"!!

میں جانتا تھا کہ وہ زہر کھارہی ہیں، اور میں نے آواز دینے کی سخت کوشش کی۔ مگر بے سود۔ میں تڑپنے لگا اور اسی کوشش میں بیہوش ہوگیا۔ معلوم نہیں، کتنے گھنٹے میں بے ہوش رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اٹھ کر دیکھا۔ تہ خانے میں خواصیں اور خدام حیران و پریشان کھڑے تھے۔ میری ماں اور یورردپا ایک سیاہ پردے کے پاس مردہ پڑی تھیں، اور قریب ہی سنگِ مرمر کی صندوقچی تھی۔ آہ ! یہ وہی صندوقچی تھی۔ جس میں سے میری ماں، اور یورردپا نے زہر لے کر کھایا تھا اور یہ وہی صندوقچی تھی جس میں سے یورردپا کی حقیقی ماں نے زہر کھایا تھا ——— !*

مُقدّس درخت

حبیبِ صدق شعار ——— !

میں نے اپنے گذشتہ خط میں جس صحرائی داستان کا ذکر کیا تھا اسے ابھی ابھی مکمل کر کے ارسال کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ اس طویل رومان کا مطالعہ تم پر غور و فکر کے نئے دروازے کھول دے گا۔

کہا جاتا ہے کہ ظلم اور مظلومیت کا تصادم کرۂ ارض کے انہی حصوں میں وقوع ہو سکتا ہے جہاں تمدن ہے۔ تہذیب ہے اور تہذیب و تمدن کو اجاگر کرنے والا ذریعہ یعنی سرمایہ ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ تہذیب و تمدن کے ہنگامہ زا آغوش ہی میں ظلم و مظلومیت ——— انسانی زندگی کے دونوں تاریک اور بھیانک پہلو پرورش پاتے ہیں۔ پرورش پا کر بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ لیکن ویران صحرائی وسعتیں اس لعنت سے یکسر پاک ہیں۔ کیونکہ نہ تو یہاں دولت ہے۔ جس کی غیر منصفانہ تقسیم انسان کو خونریزی پر مجبور کر دے اور نہ یہاں جاہ و مرتبہ کی ہوس ہے جس کی عمارت کچلی ہوئی انسانی زندگی کے سینے پر کھڑی کی جاتی ہے۔ اس حقیقت کو حقیقت ثابت کرنے کے لیے بے شمار تاریخوں کے لاتعداد اوراق پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن مطالعے اور مشاہدے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ظلم اور مظلومیت کا تصادم صرف شہری دنیا ہی تک محدود نہیں اس کا وجود بے آب و گیاہ زمین پر بھی پایا جاتا ہے' اور بعض اوقات تو تہذیب و تمدن سے ناآشنائے محض ہستیاں ایسا ایسا ظلم کرتی ہیں اور انسانوں کو ایسے ایسے بے رحمانہ طریقوں سے ہلاک کرتی ہیں کہ شہر

کے ظالم ترین دل و دماغ بھی ان کا ذکر سن کر کانپ اٹھیں۔

اگر شہروں میں حصولِ مراتب کی ہوس اور سوسائٹی کے نظام کی سخت گیری اور سرمائے کی سخت غیر منصفانہ تقسیم کے سائے میں انسانیت کی بوٹیاں نوچی جاتی ہیں تو لق و دق صحرا کے سینے پر بھی مذہبی اوہام کے سائے میں انسانیت کی رگیں کاٹی جاتی ہیں، بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ظلم و مظلومیت کے باب میں جو کچھ تہذیب و تمدن کی بلندیوں پر ہوتا ہے۔ وہی وحشت و بربریت کی گود میں بھی ہوتا ہے۔ پھر جس طرح شہروں میں "طلسمِ سامری" توڑنے کے لیے کسی "موسیٰ" کی ذاتِ مقدس کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح ان وحشت و درندگی کی پرورش گاہوں یعنی صحراؤں میں بھی ظلم کا خاتمہ کرنے کے لیے وحشی انسانوں ہی میں سے ایک وحشی میدانِ عمل میں کود پڑتا ہے، اور اپنے مقصد پر اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ یہ داستان میرے اس بیان کی تصدیق کرے گی اور یقیناً تمہیں بھی اس کی صداقت کا قائل ہونا پڑے گا۔

آجکل میں دن رات کا بیشتر حصہ خانہ بدوشوں کے یہاں گزارتا ہوں، یہ لوگ غیر معین مدت کے لیے یہاں رہیں گے۔ کیونکہ زمین کا یہ ویران حصہ انھیں بے حد پسند ہے۔

منجو کا مختصر ذکر میں نے اپنے گذشتہ خط میں کیا تھا۔ یہ شخص خانہ بدوشوں کے سردار کا چھوٹا بھائی ہے۔ اور مجھ سے چند دن میں اتنا بے تکلف ہو گیا ہے جتنا بہرام۔ منجو بلا کا ذہین ہے ہر چیز، ہر واقعے پر غور و خوض کرتا ہے اور بعض اوقات اپنے انفرادی مشاہدے سے جو نتائج اخذ کرتا ہے وہ لاریب ایک پختہ کار اور بیدار ذہن کی ہی پیداوار معلوم ہوتے ہیں دن بھر تو ہم تینوں یعنی میں، آغا بہرام اور منجو شوہان اور شوہان کے اِرد گرد پھرتے رہتے ہیں اور جب شام کی تاریکی پھیلنے لگتی ہے تو منجو کے خیمے میں چلے جاتے ہیں۔ پھر نصف رات تک اور بعض اوقات صبحِ کاذب تک طرح طرح کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ خانہ بدوشوں کا سردار بھی بڑا ملنسار آدمی ہے اور وہ بھی بڑی دلچسپی سے ہماری گفتگو میں حصہ لیتا رہتا ہے۔

میرا معمول ہے کہ ہر رات کم از کم ایک داستان ضرور سنتا ہوں اور چونکہ ایک مہینے سے ان خانہ بدوشوں کے یہاں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اس لیے اب تک کم و بیش تیس داستانیں سن چکا ہوں۔ ان داستانوں میں زیادہ تعداد ان واقعات کی ہے جو صرف حسن و

عشق کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے سوا ان میں اور کچھ بھی نہیں۔ میں نے ان تیس داستانوں میں سے صرف پانچ منتخب کی ہیں جو وقتاً فوقتاً بھیجتا رہوں گا۔

یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ منجو بذاتِ خود عشق کی پرخار وادی سے گزر چکا ہے اور اس اولوالعزمی اور عالی ہمتی کے ساتھ گزر چکا ہے کہ جب تم اس کی داستانِ حیات سنو گے تو عش عش کر اٹھو گے۔

میرے نقطۂ نظر سے خلوص اور قربانی ہی محبت کا دوسرا نام ہے۔ اور اس نوجوان نے محبت کے لیے جو جو قربانیاں کی ہیں وہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ منجو کا افسانہ جلد سے جلد تمہارے پاس پہنچ جائے۔ مگر ابھی یہ افسانہ مکمل نہیں ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے سینے کی گہرائیوں میں محبت کی آگ سلگ رہی ہے ——— اور محبت کی آگ اگر سلگتی رہے تو تمام عمر سلگتی رہتی ہے۔ مگر جب شعلوں میں تبدیل ہو جائے اس وقت انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میں نے منجو کو بہت پاکیزہ خصلت انسان پایا ہے۔ لیکن اپنے بھائی کی حیثیت حاصل کرنے کے لیے اس کا دل بھی کبھی کبھی بے چین ہو جاتا ہے۔ خیر یہ ایک عام انسانی کمزوری ہے اور کمزوری کو ہٹانا واقعی سیرتِ انسانی کی بلندی ہے۔

دوست! میرے پیارے!! آج میں تمہیں ایک ایسی بات سنانے والا ہوں جسے پڑھ کر تم چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھوں پر اعتبار کھو دو گے۔

تو سنو ——— !

خانہ بدوشوں کی دنیا میں ایک لانبی لانبی پلکوں والی لڑکی ادھر اُدھر دوڑتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس دلنواز ہستی کی ہر ادا نے میرے دل پر خاص اثر کیا ہے ——— اور کر رہی ہے۔ تم کہو گے آج صحرا نورد نے محبت کی دنیا میں قدم رکھ دیا ہے ——— داگرچہ یہ تجربہ میرے لیے نیا نہیں، مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرا قدم اس دنیا میں آگے نہیں بڑھے گا۔ یہیں رہے گا۔ مجھے ابھی دنیا کے گوشے گوشے میں جانا ہے، بہت کچھ دیکھنا ہے، بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اور محبت کی اسیری اس راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی۔ کیوں

درست ہے نا ؟

دوست ! مجھے اپنے دل پر پورا پورا قابو ہے اور میری یہ خود اعتمادی کسی چیز کو بھی فرض کے راستے میں حائل نہیں دیکھ سکتی ۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جب تک یہاں رہوں گا ۔ اس لڑکی سے گفتگو کرتا رہا ہوں گا آخر گفتگو میں کیا ہرج ہے ؟

مجھے تم سے ایک شکوہ ہے ۔ میں گوناگوں رکاوٹوں کے باوجود تمہیں "تحریری طور" پر یاد کرتا رہتا ہوں ۔ مگر تم اس قدر تساہل کیش ہو کہ رومان کے مطالعے کے بعد ایک خط بھی نہیں بھیج سکتے ۔ حالانکہ تم یہ کام بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتے ہو ۔ شہر میں کس چیز کی کمی ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک رومان کے متعلق تمہارا نقطۂ نظر معلوم کروں ۔ امید ہے تم اس سلسلے میں غفلت سے کام نہیں لوگے ۔ بس اب رخصت ——— !

تمہارا

صحرانورد

(۱)

بوجھل رات ایک زخمی سانپ کی طرح جو بڑی دقت سے زمین پر رینگ رہا ہو ۔ اندھیرے کی سیڑھیوں پر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی چلی جا رہی تھی ۔ فضائے بسیط میں ننھے ننھے ستارے کانپ کانپ کر ، اپنی رہی سہی روشنی کا خزانہ لٹا لٹا کر تاریکی کے غار میں غائب ہو رہے تھے ——— ادھر ایک گوشے میں زرد و زرد خوف زدہ چاند خود کو بادل کے ایک ٹکڑے کے سینے میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا ۔

یکایک مقدس درخت "راشے" کے نیچے ناقوس کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی نیم عریاں وحشی انسان جو تین تین چار چار کی ٹولیاں بنا کر نخلستان میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے ۔ اپنے ہاتھوں میں جلتی ہوئی جھاڑیاں اور لکڑیاں لیے اچھلتے کودتے ، گھاتے

بجائے آندھی کی سی تیزی کے ساتھ "راشنے" کی طرف بڑھنے لگے اور کچھ دیر کے بعد درخت کے اوپر اس طرح دھواں چھا گیا گویا درخت کی شاخیں دھواں اُگل رہی ہیں۔

جیسے جیسے ناقوس کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی، صحرائی باشندوں کا شور بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب مقدس درخت کے پجاری "ہنوشی" نے ناقوس رکھ کر اپنا دایاں ہاتھ اوپر اُٹھایا اور اپنی آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ کچھ پڑھنے لگا۔ تو سکوت و جمود کا عالم طاری ہو گیا۔ تمام لوگوں کے سر فرطِ عقیدت سے جھک گئے۔ اور انھوں نے اس بات کا بھی خیال نہ کیا کہ جلتی ہوئی لکڑیوں کی آگ ان کے ہاتھوں کے بالکل قریب پہنچ گئی ہے، یا کچھ دور ہے۔

صحرائی لوگ اس درخت کو غموں اور خوشیوں کا تقسیم کرنے والا سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ وہ سال ڈیڑھ سال میں ایک مرتبہ ضرور اس کے گرد اکٹھے ہو کر اپنی عقیدت اور فرمانبرداری کا ثبوت دینے کے لیے ایک حسین اور نوجوان لڑکی کو اس پر قربان کر دیتے تھے اس قربانی کے بعد سمجھتے تھے کہ دیوتا ان پر پہلے سے بڑھ کر مہربان ہو گیا ہے۔

یہ رسم مدتِ مدید سے جاری تھی اور اب تک بے شمار جوان لڑکیوں کا سرخ خون اس درخت کے نیچے بہ کر سیاہ زمین کو سیراب کر چکا تھا۔ جب کسی لڑکی کی آغشتہ بخون نعش خاک پر تڑپنے لگتی اس وقت قربانی کے قبول ہو جانے کی خوشی میں ایک بہت بڑا جشن منایا جاتا۔ جس میں ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ جس طرح جی چاہے اپنے دل کو خوش کرے۔ جس طرح چاہے خوشی منائے۔ اور آج بھی یہ لوگ اپنی زندگی کا اہم ترین فرض ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔

اب دیوتا کے حضور میں قربانی کے پیش کرنے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اس لیے جن لوگوں کی لکڑیاں بالکل جل چکی تھیں وہ خاموشی کے ساتھ نئی جھاڑیاں یا لکڑیاں جلا جلا کر ہاتھوں میں پکڑنے لگے تھے۔ اور جن لوگوں کو اپنے عزیزوں کا انتظار تھا وہ اضطراب کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

اسی اثنا میں ایک جھاڑی کے عقب سے ایک شعلہ نمودار ہوا اور دوسرے لمحے میں

ایک پست قد بوزنہ نما انسان جھاڑی کے پاس رونما ہوگیا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر ہنس پڑے، اور چند لوگ تو اس پر طرح طرح کے آوازے کسنے لگے۔

یہ پست قد انسان قبیلے میں بدصورت ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔ سر نہایت چھوٹا۔ بال سرکنڈوں کی طرح اٹھے ہوئے۔ ایک آنکھ چھوٹی سی بدنما اور دوسری ایک بھیانک گڑھا۔ آنکھوں کے گرد لمبے لمبے حلقے پڑے ہوئے، ناک چوڑی، سخت اور بھدی۔ دائیں رخسار پر ایک بڑا سا سیاہ داغ۔ جس نے چہرے کی بدصورتی میں خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ اور مونچھیں دونوں غائب۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ اکیس بائیس برس کی ہوگی۔ مگر اس کے چہرے کی جھریاں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی ساٹھ منزلیں طے کر چکی ہے۔ اس کا نام تو "راسام" تھا مگر صحرائی لوگ اسے "غنوّ" کہتے تھے۔ ان کی زبان میں غنو کے معنی تھے ذلیل و خبیث ہستی۔ جس شخص کو اپنا غصہ اتارنا ہوتا، وہ تامل کئے بغیر غنو کو پیٹنے لگتا۔ کیونکہ اس ذلیل و خبیث ہستی کا مقصدِ حیات اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے ہر چھوٹے بڑے کی مار پیٹ، طعن و تشنیع برداشت کرے، اور منہ سے اُف تک نہ کرے، اور اب تک وہ اس فرض کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔

صحرائی لوگ قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے کہ یکایک "راشے" کے پجاری نے بلند آواز سے کہا "شوہو، ہوہو غندی" یعنی "دیوتا کی قربانی کے لیے تیار رہو جاؤ"

قہقہے بند ہو گئے اور تمام لوگ مؤدبانہ کھڑے ہو گئے —— راشے کے سامنے ناچنے والی عورت "حمارت" آگے آئی اور پاؤں میں گھنگھرو ڈال کر ناچنے لگی۔

قریباً ایک گھنٹہ تک پجاری "ہنوشی" مختلف انداز سے راشے کی ہمہ گیر قوتوں کی تعریف کرتا رہا۔ پھر درخت کے تنے سے لٹکے ہوئے ایک لمبے سے کلہاڑے کے پھل پر دائیں ہاتھ کی انگلیاں رکھ کر کڑکتی ہوئی آواز میں بولا "طلیتاہ تاہ" یعنی "قربانی کا وقت آ پہنچا" جیسے ہی اس کی انگلیاں کلہاڑے کے پھل سے علیحدہ ہو کر درخت کی ایک شاخ کو چھونے لگیں، چار جسیم و شحیم آدمی جن کے کندھوں پر کلہاڑے اور تیغے چمک رہے تھے، تیزی کے ساتھ "نمرو" کی طرف بھاگنے لگے۔

حمارت کافی دیر تک ناچتی رہی ۔ پھر لوگوں میں شامل ہو گئی ۔

"نمرد" راشے سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر، جھاڑیوں کی اوٹ میں ایک مضبوط جھونپڑی تھی، جہاں لڑکی کو بھینٹ چڑھانے سے پیشتر نصف رات تک رکھا جاتا تھا ۔

کافی دیر گزر گئی اور وہ چاروں آدمی لوٹ کر نہ آئے ۔ ہر ایک شخص کے چہرے پر اضطراب کی علامتیں نمودار ہو گئیں ۔ کچھ دیر کے بعد ان لوگوں میں سے ایک شخص بھاگتا ہوا آیا ——— اور پجاری کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ اس کا چہرہ سرخ اور دم پھولا ہوا تھا ۔

"مزینہ وہاں نہیں ہے ۔"

یہ الفاظ سنتے ہی تمام لوگوں پر بجلی سی گر پڑی ۔ مدتِ مدید سے باقاعدگی کے ساتھ "راشے" پر لڑکیاں بھینٹ چڑھائی جا رہی تھیں ۔ مگر آج تک کسی لڑکی کو بھی انکار کی جرأت نہ ہوئی تھی بھاگنے کا سوال تو کسی کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا ———

مگر آج ——— ؟

پجاری نے گرج کر پوچھا

"قربانی کہاں ہے ؟"

"وہ 'نمرد' میں نہیں ہے، دونوں محافظ قتل کر دیئے گئے ہیں ۔ ہم مزینہ کی تلاش میں دور تک بھاگتے رہے ۔" وہی شخص بولا ۔

پجاری نے لمبا سانس لیا ۔ غم اور غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا ۔ وہ "نمرد" کی طرف چلنے لگا ۔ لوگ بھی اس کے پیچھے قدم جمانے لگے ۔ نمرد پہنچتے ہی ان کے قدم رک گئے ۔ ان کے سامنے دونوں پہرہ داروں کی لاشیں زمین پر پڑی تھیں ۔

پجاری جھونپڑی کے اندر داخل ہوا ۔ اور قربانی کو تلاش کرنے لگا ۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا ۔ صرف ایک گلہری گھاس کے چند تنکے منہ میں لیے ایک طرف بھاگ رہی تھی ۔

(۲)

مقدس "راشے" کی قربانی کا رات کے ایک قلیل حصے ہیں، طاقتور پہرہ داروں کی

موجودگی میں، اس حیرت ناک طریقے پر مفقود الخبر ہو جانا ایک ایسا واقعہ تھا جو ان کی صحرائی زندگی کے کسی دور میں بھی رونما نہیں ہوا تھا اور نہ رونما ہو سکتا تھا۔ وحشی قبیلے کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جس کا دل راشے کی عظمت و جلال سے لرز نہ رہا ہو —— ہر شخص کو پورا پورا یقین تھا کہ راشے کی رضامندی اسے زندگی بخشتی ہے۔ اور راشے کا غضب اُس پر تباہی و بربادی لاتا ہے۔ جب یہ حالت ہو تو پھر مزینہ کا بھاگ جانا یا کسی شخص کا مزینہ کو بھگا کر لے جانا انتہائی حیرت انگیز اور افسوس ناک حادثہ تھا۔ سب لوگ حیرت و افسوس میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ایک طرف صحرائی قبیلے کے دونوں سردار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خالی جھونپڑی کو دیکھ رہے تھے اور دوسری طرف پجاری محافظوں کی نعشوں کو غضب آلود آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ باقی لوگ اس واقعے کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

وہ لوگ جو صحرا میں مزینہ کو چاروں طرف ڈھونڈھ رہے تھے۔ اب پجاری کے سامنے کھڑے کانپ رہے تھے۔ پجاری نے اپنا دایاں پاؤں زور سے زمین پر مارا اور گرج کر کہا۔

"نہیں لائے اسے ؟"

"وہ کہیں بھی نہیں ہے —— گم ہو گئی ہے !" ایک شخص بولا۔

پجاری چپ چاپ راشے کی طرف چلنے لگا۔ تمام لوگوں نے بھی اس کی پیروی کی، کچھ دیر کے بعد تمام قبیلہ راشے کی قربان گاہ کے گرد جمع ہو گیا۔ پجاری نے اپنا دایاں ہاتھ کلہاڑے کے پھل پر رکھ دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ قربانی دی جائے۔

لڑکیوں کے حیران و ششدر چہروں پر مُردنی چھا گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا سکراتِ موت کے عالم میں آخری سانس لے رہی ہیں۔ ایک جان گسل طویل مدت کے بعد سرداروں نے قبیلے کی تمام جوان لڑکیوں کو راشے کے نیچے ایک دائرے کی صورت میں بٹھا دیا۔ ہر لڑکی کے ہاتھ میں ایک جلتی ہوئی لکڑی موجود تھی اور ہر ایک چہرہ فرطِ خوف سے زرد تھا۔

اب پجاری آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکیوں کے دائرے میں آ کھڑا ہوا۔ لڑکیاں ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنا نام پکارنے لگیں۔ پجاری نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس طرح کھڑا

ہو گیا۔ گویا سیاہ مٹی کا ایک بت ایستادہ ہے۔

تمام لڑکیاں ایک ایک بار اپنا نام پکار چکی تھیں۔ اور پجاری بدستور بت بنا کھڑا تھا۔ تمام صحرائی خاموشی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکیاں دوبارہ اپنا اپنا نام پکارنے لگیں۔

"نمو" —— "بلام" —— "نخونی" —— "باما" — "سلطی" — "تماچی" — "ورت"

پجاری نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور زور سے چیخ ماری۔ "راشے طلی" یعنی "راشے بخشش"

جس لڑکی نے اپنا نام ورت بتایا تھا۔ اس کی آنکھوں کے ڈیلے پھیل گئے۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جلتی ہوئی لکڑی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ ایک سردار نے اس نیم مردہ لڑکی کو بازوؤں پر اٹھا لیا اور راشے کے نیچے لے جا کر بٹھا دیا۔

لڑکی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرنے لگی۔

پجاری نے کلہاڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یکایک قریب سے آواز آئی۔

"مزینہ اور سمرم" کھنڈر میں چھپے ہوئے ہیں"

پجاری نے سامنے دیکھا۔ راشے کے سامنے ناچنے والی عورت حمارت کھڑی تھی۔ حمارت کے ان الفاظ نے لوگوں پر عجیب اثر کیا۔ یک لخت وہ جوش و خروش جاتا رہا۔ عقیدت و فرمانبرداری رخصت ہو گئی۔

ایک حیرت انگیز واقعے کے بعد دوسرا حیرت انگیز واقعہ!

پجاری نے انتہائی غصے کے عالم میں حمارت کی طرف دیکھا۔

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے سمرم کو دیکھا ہے۔ اس کی گود میں مزینہ تھی" رقاصہ نے بے جھجک کہا۔

"سمرم، میرا بیٹا؟" پجاری نے کڑک کر کہا۔

"ہاں راشے مو"

پجاری نے سب لوگوں پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اور بلند آواز سے کہا "جاؤ!"

دس بارہ آدمی تیزی کے ساتھ بھاگنے لگے۔

اب پجاری نے کلہاڑا اٹھایا —— لڑکی چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔ تمام لوگ سجدے میں گر پڑے، چند منٹ تک یہ عالم رہا۔ پھر جب انھوں نے ناقوس کی آواز سُنی تو سر اٹھایا اور دیکھا کہ لڑکی کے بجائے اب ایک نعش خاک و خون میں تڑپ رہی ہے۔

تمام لوگ خوشی سے ناچنے لگے۔

پجاری نے اپنا ہاتھ نعش کے سینے پر رکھا اور پھر اس خون میں شرابور ہاتھ کو "راشے" سے لگا دیا۔

زندگی کی خوشیاں اور دکھ دینے والا دیوتا اس قربانی سے ان پر مہربان ہوگیا تھا۔

جشن ہوتا رہا۔ وحشی لوگ وحشیانہ انداز سے اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے رہے وہ پونے دو گھنٹے کے بعد وہ لوگ، جو مزینہ اور سمرم کو پکڑنے گئے تھے۔ واپس آگئے۔ انھیں دیکھتے ہی مجمع دم بخود ہوگیا۔

قبیلہ کا سردار آگے بڑھا اور بولا:

"ہم کھنڈر کے قریب پہنچے تو چیخ کی آواز سُنی فوراً ادھر بھاگے۔ جھاڑیوں کے پاس کوئی انسان تڑپ رہا تھا۔ سب سے پہلے میں وہاں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ غنوّ سخت زخمی حالت میں پڑا ہے، اس کے بعد ہم کھنڈر میں گئے۔ وہاں نہ مزینہ تھی نہ سمرم!

اب دوسرا آدمی آگے بڑھا۔ اس نے دم توڑتے ہوئے غنوّ کو زمین پر لٹا دیا۔ پجاری نے غنوّ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر راشے کی تعریف کرنے لگا۔

ورت کی نعش کو حسبِ معمول زمین کھود کر دفن کر دیا گیا۔ اس کے بعد جشن ہونے لگا۔ اور صبح تک ہوتا رہا۔

جب سورج طلوع ہوا تو راشے کے نیچے سوائے بے حس و حرکت غنوّ کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

(۳)

رات نصف کے قریب گزر چکی تھی۔ مقدس راشے کا پجاری اپنے دونوں ہاتھوں میں

لمبی لمبی جلتی ہوئی لکڑیاں لیے درخت کے نیچے سر جھکائے کسی خیال میں غرق کھڑا تھا۔
اس کے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر جھاڑیوں کے ایک انبار کے پاس رقاصہ "حمارت" افسردگی کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ کبھی تو وہ ناچتے ناچتے لکڑیوں کی کمزور اور ضعیف روشنی سے اس قدر دور چلی جاتی کہ معلوم ہوتا تاریکی میں ایک سایہ کانپ رہا ہے۔ اور کبھی اس درجہ قریب آجاتی کہ اس کا افسردہ چہرہ صاف طور پر نظر آنے لگتا۔

رقاصہ ناچتی رہی۔ کافی دیر ناچتی رہی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ پجاری اس کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ اس نے جھنجھلا کر پاؤں زمین پر مارا۔ گھونگروؤں کی جھنکار فضا میں گونج اٹھی۔ پجاری نے نیم باز آنکھوں سے حمارت کو دیکھا اور دائیں ہاتھ کی لکڑی منہ میں رکھ کر اپنا شانہ کھجلانے لگا۔ پھر لکڑی منہ سے ہٹا کر بائیں طرف لٹکے ہوئے کلہاڑے کے پھل کو دیکھنے لگا۔

یکایک کلہاڑے کا پھل زیادہ چمکنے لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا: رقاصہ اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

"حمارت! ناچتی کیوں نہیں۔ کس کے حکم سے یہاں آگئی ہے؟ ۔ ناچ۔ اس وقت تک ناچتی رہ جب تک میں تجھے چلے جانے کا حکم نہ دوں"۔
"آپ تو کسی خیال میں غرق ہیں۔ جب کوئی دیکھنے والا ہی نہ ہو۔ اس وقت ناچ کی ضرورت کیا ہے؟" رقاصہ نے بے خوف ہو کر کہا۔

"لعنت ہو راشٹے کی تم پر —— ملعون عورت! تو میرے لیے ناچتی ہے یا راشٹے کے لیے؟"

"دونوں کے لیے۔ کیونکہ راشٹے ہمیں زندگی کی خوشیاں اور دکھ دیتا ہے اور آپ راشٹے کے بیٹے ہیں، دونوں کا وجود ہمارے لیے قابلِ احترام ہے۔ مگر راشٹے مو! میرے دل میں ایک آگ سی لگی ہے —— میرے سینے میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں"۔
"کیوں سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟ راشٹے کے پجاری سے کوئی بات چھپانا اپنی زندگی سے دشمنی کرنے کے برابر ہے۔ جو کثافت تمہارے دل میں ہے۔ اسے باہر نکال دو ——

میں تجھے عزیز سمجھتا ہوں۔ اس لیے تمہاری مدد کروں گا"۔

رقاصہ خاموشی کے ساتھ پجاری کے دائیں ہاتھ کی لکڑی دیکھنے لگی۔ جسے ایک چٹختا ہوا شعلہ تیزی کے ساتھ نگل رہا تھا۔

"آپ کی لکڑی بجھ گئی —— اور جھاڑی لاؤں آپ کے لیے راشے مو؟"

یہ کہہ کر حمارت اندھیرے میں گم ہو گئی۔ یکایک ایک چیخ گونجی، اور اس سے پیشتر کہ پجاری ادھر جائے۔ رقاصہ ایک پُرخار لکڑی لیے ہوئے وہاں پہنچ گئی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں" رقاصہ ہنس پڑی۔ جب میں عنتو کی نعش کے قریب پہنچی۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے پاؤں کو کھینچ رہا ہے —— ایک گیدڑ تھا صرف"۔

"گیدڑ —— تم گیدڑ سے ڈر گئیں یا نعش سے؟"

"میں کسی سے بھی نہیں ڈرتی۔ میں جانتی ہی نہیں ڈر کیا چیز ہے۔ اس وقت کسی نے میرا پاؤں پکڑ لیا تھا۔ بے اختیار چیخ نکل گئی۔ یقیناً گیدڑ نے میرے پاؤں کو کاٹ کھایا ہے"۔

رقاصہ نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ اس کا پاؤں لہولہان تھا۔

"حمارت! میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، صاف صاف بتاؤ۔ تم جانتی ہو۔ راشے کے پجاری سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہو سکتی"۔

پجاری نے یہ کہہ کر دوسری لکڑی جلائی، اور رقاصہ کے بالکل قریب کھڑا ہو گیا۔

"میرے قبیلے میں تم سب سے زیادہ چالاک عورت ہو۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ مزینہ اور سمرم کے درمیان کس قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے؟"

"راشے مو! میں اس سوال کا کیا جواب دوں؟ وہ دونوں مقدس راشے کی عظمت سے غافل ہو گئے تھے۔ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ جہاں جائیں گے۔ راشے کے غضب کی آندھی ان کے ساتھ جائے گی"۔

"لیکن جب تم نے انھیں بھاگتے ہوئے دیکھا تو ہمیں کیوں نہ بتایا۔ راشے کا قہر و غضب ہمیں جلا کر خاک سیاہ کر دے گا"۔

"راشے مو! میں نے ہی بتایا تھا کہ وہ بھاگ رہے ہیں۔ اور ——"

رقاصہ کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔

"میں راشے کے سائے میں عہد کرتی ہوں کہ جب تک انھیں تلاش نہیں کر لوں گی چین سے نہیں بیٹھوں گی۔"

پجاری کے دائیں ہاتھ کی لکڑی ابھی نصف کے قریب بھی نہیں جلی تھی کہ اس نے فرطِ جوش میں اسے دور پھینک دیا —— رقاصہ نئی لکڑی لانے کے لیے چلی گئی۔

جھاڑیوں کے انبار میں ہاتھ ڈال کر رقاصہ نے ایک خاردار لکڑی اٹھائی اور چلنے لگی۔

اچانک فضا میں آواز گونجی۔ "حمارت!"

یہ آواز پجاری کی تھی۔ حمارت بھاگ کر راشے کے نیچے پہنچی۔ پجاری اب بیٹھا ہوا تھا، چند لمحوں تک رقاصہ کو کچھ بھی نہ نظر آیا۔ مگر جب اس نے جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر دیکھا۔ پجاری کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

رقاصہ چیختی ہوئی بھاگی۔ چند منٹ کے بعد بے شمار لوگ پجاری کے گرد جمع ہوگئے۔ انھوں نے اس کے زخم کا جائزہ لیا۔ زخم بہت گہرا تھا۔ اور وہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو چکا تھا۔

پہلے تو "قربانی" کا فرار ہو جانا اور پھر مقدس راشے کے بیٹے پر بے رحمانہ حملہ۔ قبیلے کا ہر شخص کانپنے لگا۔ ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ عنقریب راشے کا قہر و غضب تمام قبیلے کو تباہ و برباد کر دے گا۔

چونکہ حادثے کے وقت سوائے رقاصہ کے پجاری کے پاس اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس لیے قاتل کے متعلق اسی سے استفسار ہونے لگا۔

اس نے سب سے پہلے تمام باتوں کو دہرایا۔ پھر ایک سردار کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔

"میں نے اس کی صورت اندھیرے میں دیکھی تھی۔"

سردار نے زخمی پجاری کے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ "راشے"

مگر اس سے پیشتر کہ وہ قسم کھائے اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔
مقتول سردار کی صرف ایک لڑکی تھی اسنہ۔ اس لڑکی کو اپنے باپ سے اس قدر محبت تھی کہ تمام قبیلے میں ضرب المثل بن کر رہ گئی تھی۔
اسنہ اپنے باپ کے بے رحمانہ قتل پر روتے روتے بے ہوش سی ہوگئی۔

(۴)

مکمل ایک دن اور ایک رات سفر کرنے کے بعد سمرم اور مزینہ ایک چشمے کے کنارے پہنچ گئے۔ ایک تو تھکاوٹ اور دوسرے بھوک پیاس کی شدت کا یہ حال کہ گفتگو کرنے کی سکت بھی ان کے اندر نہیں تھی۔ پانی پینے کے بعد جب ان کے ہوش ٹھکانے آئے تو سمرم نے اپنی محبوبہ کا سر زانو پر رکھا اور پیار بھرے لہجے میں بولا
"مزینہ تھکاوٹ سے ہمارا برا حال ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ وہ لوگ تعاقب کر رہے ہوں گے۔ اگر ان میں سے کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو ہماری جان کی خیر نہیں"
"میں تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ مجھے بہر حال مرنا ہے۔ خواہ راستے کی بھینٹ چڑھ جاؤں۔ یا سرداروں کے تیغے میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ تم نے سخت غلطی کی کہ پہرہ داروں کو قتل کر کے مجھے لے آئے"
"کیا کرتا، مجبور تھا ـــــ اندھا تھا ـــــ محبت اندھا کر دیتی ہے"
"اب تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے!"
"اگر ہم ان کے علاقہ میں چلے گئے۔ تو یقیناً ہمارا یہی حال ہوگا"
"سمرم! اب بھی وقت ہے چلو واپس چلیں"
"نہیں، ہرگز نہیں۔ ہم ان ظالموں کے قریب بھی نہیں جائیں گے۔ زمین بہت وسیع ہے کسی گوشے میں جا کر راحت کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ یہ لوگ ہمارا نشان تک بھی نہ پا سکیں گے"
"کیا تمہارا خیال ہے۔ انھوں نے ہمیں اس طرف بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا؟"

مزینہ نے اپنا سر اپنے محبت کے زانو پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ہم سب ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔"

"تم نہیں جانتے ——— جب ہم کھنڈر میں داخل ہوئے تو غنتو کچھ دور کھڑا تھا۔"

"وہ مکروہ انسان کیا کر سکتا ہے؟" سمرم ہنس پڑا۔

"غنتو قبیلے سے کہہ دے گا اور وہ ہمارے پیچھے بھاگیں گے ——— بلکہ بھاگ رہے ہوں گے۔ اور ہمیں جہاں بھی دیکھیں گے، ہماری بوٹیاں اڑا دیں گے ——— میری مانو، چلو، واپس چلیں۔ پجاری تمہیں معاف کر دے گا۔ آخر تم اس کے بیٹے ہو۔"

"پھر میں زندہ رہ کر کیا کروں گا ——— زندہ رہیں گے تو دونوں اور مریں گے تو دونوں ——— چلو مزینہ آگے چلیں۔"

"آگے کہاں؟"

"آگے ——— کافی دور ——— مزینہ، ایک مرتبہ میں پہلے بھی آ چکا ہوں یموق کو جانتی ہو۔ اس نے ایک سردار کو قتل کر دیا تھا۔ اور پھر بھاگ گیا تھا۔ ہم نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ جب میں یہاں سے دور، اس کے قریب پہنچا۔ تو یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر رحم طلب آواز میں کہا تھا۔

تم مجھے قتل کر کے میرا سر آسانی کے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ مگر کیا تم مجھے معاف نہیں کر دو گے؟

اس وقت اس کا لہجہ اتنا دردناک تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور وعدہ کر لیا کہ لوگوں سے کہہ دوں گا یموق صحرا سے نکل کر کہیں چلا گیا ہے یا مر گیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یموق اسی صحرا میں رہتا ہے۔ ہم اس کی جھونپڑی میں رہیں گے۔"

"یموق قبیلے کو خبر کر دے گا۔"

"کیوں اسے اپنی جان کی ضرورت نہیں؟"

مزینہ اٹھ بیٹھی، سمرم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دونوں گرم ریت پہ چلنے لگے۔

(۵)

رقاصہ شام کی تاریکی میں کھنڈر کے قریب سے گذر رہی تھی کہ اس کے کانوں میں سسکیوں کی آواز آئی۔ اس کے قدم رک گئے۔ اور وہ پلٹ کر کھنڈر کو دیکھنے لگی۔ اور پھر ادھر اُدھر نظر دوڑانے لگی۔ کسی طرف بھی کوئی سایہ موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے وہم پر مسکرائی اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھانے لگی۔

ابھی اس نے چند ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ پھر سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ رقاصہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اور آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگی۔

آواز بند ہوگئی۔

مگر اب رقاصہ کے دل میں یقین پیدا ہوچکا تھا کہ اس کے قریب کوئی نہ کوئی ہستی موجود ہے۔

اب سسکیوں کی بجائے رونے کی آواز آرہی تھی۔

وہ دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگی۔ دیوار کے آخری سرے پر پُہنچ کر اسے محسوس ہوا کہ یہ آواز اندر سے آرہی ہے۔ اس نے شگاف میں سے جھانک کر اندر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں آخری گوشے میں ایک سایہ حرکت کر رہا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر سانس روک کر اندر قدم رکھا، آہستہ آہستہ اس گوشے میں پہنچ گئی۔

اب چاند کی مدھم روشنی میں اس کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔

استہ اپنے مرحوم باپ کا کٹا ہوا سر اپنے زانو پر رکھے زار و قطار رو رہی تھی۔

رقاصہ کا دل بھر آیا۔ اس نے چاہا کہ مظلوم عورت کو تسلی دے کہ استہ بڑے جوش و خروش کے عالم میں کہنے لگی:

میرے مقدس باپ! تیرے قاتل پر راشے کی لاکھ لاکھ لعنتیں۔ میرے باپ تو بے گناہ ہے، تونے راشے موکو ہرگز قتل نہیں کیا۔ ناچنے والی عورت نے تیرے ساتھ دشمنی کر کے تجھے ہلاک کیا ہے، لیکن اب وہ بھی زندہ نہیں رہے گی۔ میں تیرے قابلِ احترام سر پر

ہاتھ رکھ کر قسم کھاتی ہوں کہ جب تک حمارت کو قتل نہ کر ڈالوں گی اپنے اکلوتے بچے کی صورت نہیں دیکھوں گی۔ میرے باپ تیری پھٹی ہوئی آنکھیں انتقام چاہتی ہیں اور میں انتقام لے کر ہی چھوڑوں گی۔ خواہ اس میں میری زندگی ختم ہو جائے ——— میرا سب کچھ لٹ جائے۔"

استہ پھر کہنے لگی۔

"میرے مقدس باپ! میں صرف چند گھنٹوں میں تیرا انتقام لوں گی۔ میرا تیغہ حمارت کے جسم کی بوٹی بوٹی اڑا دے گا ——— اس وقت تو کس قدر خوش ہوگا۔"

استہ نے فرطِ عقیدت و محبت سے مجبور ہو کر اپنے ہونٹ اپنے مردہ باپ کی بائیں آنکھ سے لگا دیئے۔

رقاصہ چپ چاپ یہ منظر دیکھتی رہی۔ اسے کبھی خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی زندگی اتنے خطرے میں ہے۔ اس کے اور استہ کے درمیان گہری محبت تھی اور دونوں کو ایک دوسرے پر پورا پورا اعتماد تھا۔ اس لیے استہ کو اپنا ارادہ پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

بے اختیاری کے عالم میں حمارت نے اپنے سینے کے پاس چھپا ہوا خنجر نکالا اور دوسرے لمحے میں استہ کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل کر فضا میں گم ہو گئی۔

"مجھے قتل کرنا چاہتی تھی ملعون!" رقاصہ نے اپنا خنجر استہ کی پشت سے نکالتے ہوئے کہا

"حمارت! ——— تو ———" تڑپتی ہوئی عورت نے کہا۔

"ہاں میں ہوں بزدل لڑکی!"

"لیکن تو بھی زندہ نہیں رہے گی۔"

یہ کہہ کر استہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر رقاصہ کی کلائی پکڑ لی۔ رقاصہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی کلائی چکنا چور ہو گئی ہے۔ اس نے پورے زور کے ساتھ استہ کو پیچھے دھکیلا استہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ حمارت باہر آئی اور بھاگنے لگی۔

(۶)

دوسرے دن دوپہر کے وقت سمرم کو کہیں جا کر یموق کی جھونپڑی ملی۔ یموق جھونپڑی

بس نہیں تھا۔ اس لیے سمرم نے اپنی محبوبہ کو تو اندر بھیج دیا اور خود جھونپڑی سے کچھ دُور جاکر ٹہلنے لگا۔

یموق نے جیسے ہی اپنی جھونپڑی کے پاس کسی انسان کو دیکھا فرار ہونے کی تیاری کرنے لگا اگر سمرم اسے جلدی سے واپس آنے کا اشارہ نہ کرتا، تو وہ بھاگ کر نہ معلوم کہاں پہنچ چکا ہوتا۔

جھونپڑی کے پاس آکر اس نے اپنے محسن کے ساتھ بڑی کشادہ دلی سے ملاقات کی۔ مگر جب اس کی داستانِ مصیبت سُنی تو خوف اور ڈر کے مارے اس کی تمام خُوشی جاتی رہی۔ سمرم نے اسے یقین دلایا۔ کہ دُشمنوں کو اس کے یہاں پہنچنے کی قطعاً خبر نہیں ہے اور نہ وہ اسے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اطمینان کی یہ بات سن کر یموق کی جان میں جان آئی۔

جھونپڑی کے اندر جاکر یموق سمرم کی محبوبہ کو بڑی حیرت سے دیکھنے لگا۔ گیارہ سال سے اس نے عورت کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس لیے اب عورت کو دیکھ کر وہ جتنی حیرت کا اظہار کرتا کم تھا ——— !

مزینہ پہلے پہل تو اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کو دیکھ کر ڈر گئی۔ مگر جب سمرم نے اسے ہر طرح تسلی دی اور یموق کو ایک نہایت شریف انسان بتایا۔ تو اس نے خوشی خوشی وہاں رہنا منظور کر لیا۔

اس طرح تینوں مجرم ہستیاں اس جھونپڑی میں زندگی بسر کرنے لگیں۔

ایک دن جبکہ محب اور محبوبہ، دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ یموق گھبرایا ہوا اندر آیا اور آتے ہی کہنے لگا۔

"اب یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ——— دُشمنوں کو ہماری اطلاع مل چکی ہے اور وہ یہاں پہنچ چکے ہیں"

سمرم جانتا تھا کہ طویل عزلت گزینی نے یموق کو وہمی انسان بنا دیا ہے۔ اس لیے اس نے ہنس کر کہا

"تو تم نے ان کا مُقابلہ کرکے اُنھیں بھگا دیا ہوگا؟"

"یہ ہنسی کی بات نہیں سمرم ——— میں نے اپنی آنکھوں سے ایک عورت کو دیکھا ہے۔"

"عورت یہاں؟"

"ہاں میری آنکھوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا ہے۔ میں نے اُسے دوبارہ دیکھا ہے۔ پرسوں جب میں صبح کے وقت جھونپڑی سے باہر نکلا۔ تو کوئی شخص مجھے دیکھ کر بھاگ گیا۔ اس وقت تو میں نے اسے صرف واہمے پر محمول کیا۔ مگر رات کو تو یہ واہمہ حقیقت میں بدل گیا۔ سچ کہتا ہوں وہ عورت ہے۔"

"کہاں کھڑی تھی وہ؟" مزینہ نے پوچھا ——— اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"ٹیلے کے پاس!"

"تو تم نے اس کا تعاقب نہیں کیا؟" سمرم نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں طنزیہ رنگ غالب تھا۔

"وہ فی الفور غائب ہوگئی ——— نہ معلوم کہاں چھپ گئی۔ تعاقب کیا کرتا؟"

"یموق! اگر تم کہتے کہ کوئی مرد دیکھا ہے۔ تو ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت پیش آتی۔ مگر عورت ——— میں یہ بھی نہیں مان سکتا۔ کہ کوئی عورت یہاں پہنچ سکتی ہے۔ کسی عورت کو کیا پڑی ہے کہ اپنے شوہر کی آغوش چھوڑ کر یہاں بھٹکتی پھرے؟ تم عورت کے بھوکے ہو، اور کئی بار کہہ چکے ہو۔ میرے لیے عورت لاؤ۔ اس لیے اگر یہاں واقعی عورت آگئی ہے تو تمہیں مسرور ہونا چاہیئے، نہ کہ خوفزدہ، تمہاری آرزو پوری ہوگئی ہے۔"

یہ کہہ کر سمرم نے قہقہہ لگایا اور یموق بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد مزینہ کہنے لگی

"اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

"کیوں، یہ شخص تو بالکل وہمی ہے۔ کوئی عورت وورت یہاں نہیں آسکتی۔ یہ جھونپڑی تو ایسی جگہ ہے کہ کسی کو اس کا نشان تک نہیں مل سکتا۔"

"مجھے کسی عورت کے آنے کا خطرہ نہیں۔" مزینہ نے جھونپڑی کے دروازے پر نظر ڈال

کر کہا

"تو خطرہ پھر کس کا ہے ؟"

"یہ شخص مجھے ہر وقت گھور گھور کر دیکھتا رہتا ہے ـــــ اور جب یہ گھور کر دیکھتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی مجھ سے چمٹ جائے گا۔ میں اس سے ڈرتی ہوں ؟"

سمرم نے بلند قہقہہ لگایا

یہ آدمی بالکل بے ضرر ہے۔ میں اسے سختی سے منع کر دوں گا کہ تمہاری طرف گھور گھور کر نہ دیکھے ـــــ اس پر بھی اگر وہ باز نہ آیا تو میں اسے ہلاک کر دوں گا ؟"

مزینہ مطمئن ہو گئی ـــــ !

(۷)

صحرائی قبیلے میں یہ خبر، کہ پجاری کو اپنی زندگی کی امید نہیں اور مقدس راشے کے نیچے نئے پجاری کا حکم سننے کے لیے رات دن لیٹا رہتا ہے، بادِ صرصر کے جھونکوں کی طرح ہر طرف پھیل گئی تھی۔ تمام وحشی ہر روز پجاری کے گرد جمع ہو جاتے تاکہ نئے پجاری کا نام معلوم کریں۔ مگر پجاری انھیں یہ کہہ کر مایوس کر دیتا کہ ابھی تک راشے نے کوئی اطلاع نہیں دی۔

ایک دن اتنی تند اور خوفناک بادِ صرصر چلی کہ دو تین جھونپڑیاں گر پڑیں اور ایک آدمی بھی مر گیا۔ لوگوں نے یقین کر لیا کہ راشے نے غضب ناک ہو کر ہمیں تباہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ پے در پے اس کی سخت توہین کی گئی ہے۔

اس وقت تمام صحرائی لوگ خوفزدہ ہو کر راشے کی پناہ مانگنے کے لیے درخت کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

پجاری نے ناقوس بجانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد لوگ کافی دیر تک سر بہ سجدہ رہے پھر جب پجاری کا اشارہ پا کر کھڑے ہوئے تو پجاری نے راشے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"نئے پجاری کا فیصلہ ہو گیا ہے ؟"

لوگ پجاری کے پاس پہنچنے کے لیے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔

"مجھے راشٹے نے بتا دیا ہے کہ اس کا بیٹا کون ہے؟"

"کون ہے ہمارا مالک؟" کئی لوگ چلائے

پجاری تھوڑی دیر تک کھانستا رہا۔ پھر بولا۔

"راشٹے کا پجاری سمرم ہے!"

"سمرم" —— ہر شخص حیرت میں ڈوب گیا۔

"سمرم نے راشٹے کی توہین کی ہے۔ مگر راشٹے نے اس کا قصور معاف کر دیا ہے یہ بات راشٹے نے مجھے بتا دی ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ملے لے آؤ اور راشٹے کا پجاری بنا دو ——!"

"مگر وہ مجرم ہے!" ایک سردار نے کہا۔

"تم کون ہو راشٹے کے معاملات میں دخل دینے والے؟" پجاری نے غضبناک ہو کر کہا۔

"میں نے جو کچھ کہہ دیا ہے، راشٹے کا حکم ہے"

تمام لوگ دم بخود رہ گئے۔

(۸)

مزینہ غنودگی کے عالم میں سوکھے ہوئے گھاس کے اوپر لیٹی ہوئی تھی کہ معاً ایک وہم سا اس کے دل و دماغ میں رینگنے لگا۔

نہ تو اس کا محب جھونپڑی میں تھا۔ اور نہ یموق —— اگر اس حالت میں کوئی دشمن آئے اور اسے اٹھا کر لے جائے تو وہ کیا کر سکتی ہے۔ اس کے اندر نہ تو تابِ مقاومت ہے اور نہ وہ کہیں چھپ سکتی ہے۔

" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

سامنے ایک ٹنڈ منڈ درخت کی ٹہنی پر ایک گدھ بیٹھا پر پھڑپھڑا رہا تھا —— دیکھتے ہی دیکھتے گدھ نے ایک چیخ ماری اور اُڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی مزینہ خوفزدہ ہو کر بے اختیاری کے عالم میں پیچھے ہٹ گئی۔

درخت کے عین نیچے ایک عورت کھڑی تھی —— جو دائیں طرف دیکھ رہی تھی۔ مزینہ بے حس و حرکت اسے دیکھنے لگی۔ اس عورت کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ مزینہ کا دل بے اختیار چاہا کہ بھاگ جائے۔ مگر اب جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکلنا سخت خطرناک تھا۔

اس عورت کے ہاتھ میں کوئی چیز چمک رہی تھی —— ایک خنجر!

مزینہ پیچھے ہٹتی گئی —— اور پھر لیٹ گئی۔

وہ عورت چند لمحے کھڑی دائیں طرف دیکھتی رہی —— پھر مزینہ نے دیکھا کہ اس کے پاؤں جھونپڑی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یکایک جھونپڑی میں ایک آواز گونجی۔

"ذلیل عورت تو کہاں بھاگ کر جا سکتی ہے؟"

مزینہ سانپ کی طرح رینگتی ہوئی جھونپڑی کے آخری گوشے میں پہنچ گئی۔ یہاں گھاس کے پیچھے ایک سوراخ تھا۔ مزینہ گھاس اٹھانے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ دھوئیں سے اس کا دم گھٹنے لگا ہے۔

(۹)

سمرم نے چشمے کے کنارے پہنچ کر خون آلود ہاتھوں کو صاف کیا اور غیر ارادی طور پر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

فضا میں دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے اڑے چلے جا رہے تھے —— وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ پھر پتوں اور گھاس سے بندھی ہوئی ہرن کی خونچکاں نعش کو اٹھایا اور جھونپڑی کی طرف چلنے لگا۔

جھونپڑی کے قریب پہنچتے ہی اس کی رگوں میں بجلیاں سی دوڑنے لگیں —— اس سے کچھ فاصلے پر جھونپڑی دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ اس نے ہرن کو زمین پر رکھ دیا۔ بے تحاشا بھاگ کر وہاں پہنچا اور شعلوں میں چھلانگ لگا دی۔ مزینہ کو بلند آواز سے پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اسی اثنا میں ایک طرف ایک ہاتھ دکھائی دیا۔ سمرم شعلوں کو چیر کر وہاں پہنچا اور ہاتھ کو اپنی طرف کھینچا۔ اور ایک دم توڑتی ہوئی عورت کو بازوؤں پر اٹھا کر شعلوں سے باہر نکل آیا۔

عورت کا منہ جھلس چکا تھا۔ سر کے بال نصف کے قریب جل چکے تھے۔ اس کے علاوہ بدن کے اکثر حصوں پر چھالے پڑ چکے تھے۔

وُہ بوجھ کو سر پر اٹھائے چشمے کے پاس آیا اور اسی عالم میں پانی کے اندر اُتر گیا۔

عورت کا چہرہ بالکل جھلس چکا تھا۔ اور آخری سانس لے رہی تھی —— سمرم نے بے چینی سے اس کے ہاتھوں کو ہلایا۔ عورت نے اپنی زبان باہر نکالی، بولنے کی کوشش کی، مگر بول نہ سکی۔ اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ سمرم نے نعش کو کنارے پر رکھ دیا اور خود بے حس و حرکت کھڑا زندگی سے محروم جسم کو دیکھنے لگا۔

محبت نے اس کے سینے میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ وہ بیقرار ہو کر اپنی محبوبہ سے لپٹ گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ جب طوفانِ اشک تھما تو اس نے اپنے چہرے کو محبوبہ کے بھیانک چہرے سے لگا دیا اور سوچنے لگا کہ اس ہستی کے لیے اس نے تمام قبیلے کی دشمنی مول لی تھی، اس ہستی کی خاطر زندگی کی خوشیاں اور دکھ دینے والے مقدس راشے کو خود پر ناراض کر لیا تھا اور اسی ہستی کی محبت پر سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔

اور اب یہ ہستی —— !

وُہ بے قرار ہو گیا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنی محبوبہ کے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

یکایک ایک شبہ کانٹے کی طرح اس کے سینے میں چبھا۔

"یہ تو کوئی اور عورت ہے —— مزینہ کا دایاں کان ایک حادثے میں اُڑ گیا تھا مگر اس عورت کے دونوں کان موجود ہیں۔ یہ مزینہ نہیں کوئی اور عورت ہے۔"

اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا۔ اور وہ کافی دیر تک مردہ عورت کا چہرہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔

اب اس کے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ "مزینہ نہیں کوئی اور عورت ہے —— مگر اس لمحے میں ایک خوفناک خیال نے اس کی تمام امیدوں کا گلا گھونٹ دیا۔

"کہیں میری محبوبہ جل تو نہیں گئی"۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے اجنبی عورت کا سر اپنے زانو پر سے ہٹایا۔ اور بھاگا بھاگا وہاں پہنچا۔

اب جھونپڑی کے بجائے خاکستر کا ایک تودہ پڑا تھا۔

اس نے گرم گرم خاکستر پر پاؤں رکھ دیئے۔ اور اپنی محبوبہ کی نعش ٹٹولنے لگا۔

مگر بے سود۔ لوہے کے تپتے ہوئے اوزاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا ——!

اس کا دل پوری طرح مطمئن ہو گیا۔ کہ اس کی محبوبہ زندہ ہے۔

اس کے بعد وہ پھر چشمے کی طرف چلا۔ اس کی عدم موجودگی میں گدھوں کے غول کے غول نصف سے زائد نعش چٹ کر چکے تھے۔ اس نے چاہا کہ ایک مرتبہ اور اس عورت کے چہرے کو غور سے دیکھے —— مگر جب وہ نعش کے قریب پہنچا۔ تو دیکھا عورت کے چہرے پر جگہ جگہ سے ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں۔

گدھ کسی نعش پر بیٹھیں اور پھر وہاں گوشت رہ جائے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

وہ نعش سے دور ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے زخموں کو دیکھنے لگا۔ اور گھاس سے خون پونچھنے لگا۔ کافی دیر تک وہ اسی کام میں مصروف رہا۔ اس نے یموق کو دیکھا۔ جو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔

سمرم دوڑ کر اس کے قریب پہنچا اور پہنچتے ہی اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ "یہ کیا معاملہ ہے —— کہاں ہے مزینہ؟" سمرم نے پوچھا

یموق نے اس کے جواب میں کہا۔ "جھونپڑی کیسے جل گئی؟"

سمرم نے دوبارہ اپنے سوال کو دُہرایا

"میں کیا جانوں —— یہاں تھا ہی نہیں"۔

"یہ سب تمہاری شرارت ہے —— مزینہ کہاں ہے؟" سمرم نے گرج کر کہا۔ اور یموق کی گردن دبوچ لی۔

یموق انتہائی زور لگا کر گردن چھڑانے لگا۔ سمرم کے جلے ہوئے ہاتھ سے خون

نکلنے لگا ۔ مگر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی ۔

یموق نے اس کی پیشانی پر زور سے گھونسہ مارا ۔ اس پر بھی سمرم نے اس کی گردن کو نہ چھوڑا۔

"بتاؤ مزینہ کہاں ہے ؟"

یموق گردن چھڑانے لگا ۔ سمرم کی گرفت مضبوط ہوگئی ۔

آخر یموق نے اپنا ہاتھ اٹھایا ۔ جس کا مطلب یہ تھا "مجھے چھوڑ دو ۔ تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں "

سمرم نے گرفت ڈھیلی کر دی ۔ یموق بیٹھ گیا ۔ اور جھٹ اپنے دونوں ہاتھ سمرم کی گردن کی طرف بڑھائے ۔ سمرم نے پھرتی سے اس کی گردن کو پکڑ لیا اور اس وقت چھوڑا جب وہ مردہ ہوگیا ۔

(۱۰)

اعلان ہوتے ہی تمام صحرائی لوگ بڑے جوش وخروش کے عالم میں مقدس درخت کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے ۔ پھر ان تمام افراد نے جو وحشیوں میں اہل الرائے سمجھے جاتے تھے نئے پجاری کے انتخاب اور مرحوم پجاری کی وصیت کے متعلق گزشتہ تجربات کی روشنی میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ آخر فیصلہ ہوا کہ مرحوم پجاری مقدس راشے کو بہت عزیز تھا ۔ اور اس نے تمام عمر قبیلے کی خدمت کی تھی اس لیے اس کی وصیت پر عمل کرنا از حد ضروری ہے ۔

مگر اب سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ سمرم کہیں غائب ہو گیا تھا ۔ اور کسی شخص کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے ؟

جب یہ لوگ منتشر ہو گئے ۔ تو چند تیز رفتار جوان سمرم کی تلاش میں روانہ ہوگئے ان نوجوانوں کے علاوہ باقی لوگوں کو بھی حکم دے دیا گیا کہ سمرم کو جہاں کہیں دیکھیں بصد احترام سرداروں کے پاس لے آئیں ۔

شام کے قریب جب تمام لوگ اپنی اپنی جھونپڑیوں میں چلے گئے تو حمارت راشے کی ایک شاخ پکڑ کر سوچنے لگی ۔ یک بیک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں ۔ اور وہ اندھیرے میں

تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

کھنڈر کے قریب پہنچتے ہی اس کے دل میں ایک وہم سا پیدا ہوگیا۔ اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ اور ابھی کھنڈر سے کچھ ہی دور گئی ہوگی کہ اس کے کان میں آواز آئی۔

"حمارت! ٹھہر جاؤ!"

حمارت کے قدم رُک گئے۔ چند منٹ میں بدشکل بَونا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"حمارت! میں نے تجھے آواز پہ آواز دی!"

"تم زندہ ہو ـــــ؟"

"میں مرا کب تھا زخمی ضرور ہوا تھا۔ دیکھو میری پیٹھ۔"

عنو نے اپنی پیٹھ دکھائی۔ ایک گہرے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔

"سینے پر بھی زخم ہے اور سر میں بھی زخم ـــــ میں تو زخموں سے بھرپور ہوں۔ اس دن سردار کو ہلاک کرتے وقت لوگوں نے میری "نعش" پر دو تین وار کر دیئے تھے۔"

"اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ ـــــ تو تمہاری بوٹی بھی نظر نہ آئے۔ سخت جان ہو۔"

"میں دوسروں کی طرح مرنا نہیں چاہتا ـــــ کوئی بہت بڑا کام کر کے مرنا چاہتا ہوں۔"

حمارت ہنسنے لگی۔

"اب تم کہاں جا رہی ہو۔ صاف صاف بتا دو ـــــ

انھیں ڈھونڈنے جا رہی ہو نا؟ ـــــ وہ کہاں ہیں دونوں؟"

"مجھے کیا معلوم ـــــ ڈھونڈنے جا رہی ہوں۔"

"حمارت! میرے سامنے بھی جھوٹ ـــــ اس وقت تمام صحرا میں میں ہی تمہارا راز داں ہوں۔ اور تم میری ہمراز ـــــ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیئے۔"

"کس قسم کی مدد؟"

"تم سمجھتی ہو میں صرف ایک مکروہ بونا ہوں؟"

"تو اور کیا ہو؟" حمارت نے مسکرا کر کہا۔

"میں تمہیں ہر طرح کی مدد دے سکتا ہوں ۔ یاد ہے تم نے اسی دن اسی کھنڈر میں اپنی دشمن پر حملہ کیا تھا تم سمجھتی ہو گی وہ مر چکی ہے ۔ حالانکہ وہ مردہ نہیں ہے ۔"

"تو اور کیا ہے ؟"

"وہ زندہ ہے اور تمہارا تعاقب کر رہی ہے ۔"

حمارت کچھ سوچنے لگی

"تم نے اس دن اپنی دشمن پر نرمی سے وار کیا تھا ۔ یہ تمہاری کمزوری تھی ۔ اگر میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو میں اسے ہلاک کر دیتا ———— وہ تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد کھنڈر سے نکل گئی تھی ۔"

حمارت کچھ کہے بغیر چلنے لگی ۔ اور اندھیرے میں غائب ہو گئی ۔

(۱۱)

جب سمرم چشمے کے کنارے پہنچا تو شام کی تاریکی پھیل چکی تھی ۔ اور اردگرد کی چیزیں اس تاریکی میں غائب ہو رہی تھیں ۔

وہ ایک جگہ بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ۔

اسی اثنا میں اس نے چشمے سے دُور ایک سائے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا ۔ وہ بھاگ کر وہاں پہنچا ۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا ۔ البتہ کوئی چیز اس کے پاؤں کے قریب سے گذر رہی تھی ۔ اس نے جھک کر دیکھا ۔ ایک گیدڑ پنجر کو گھسیٹے لیے جا رہا تھا ۔

اپنی آرزو کو اس طرح خاک میں ملتے دیکھ کر صحرا کا یہ تنومند نوجوان غضب ناک ہو گیا ۔ اس نے تیغے سے گیدڑ پر وار کیا ۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور پھر پنجر پر سیاہ دھبے نظر آنے لگے ۔

وہ آگے قدم اٹھانے لگا ۔ دفعتہً ایک جھاڑی کے پاس ایک سایہ نظر آیا وہ اس طرف بھاگا ۔ سایہ بھی بھاگنے لگا ۔ گنجان جھاڑیوں کے پاس پہنچ کر سایہ غائب ہو گیا ۔

سمرم کے ہاتھ زخمی تھے ۔ اب وہ ان زخمی ہاتھوں سے خاردار جھاڑیوں کو ہٹا کر آگے بڑھنے لگا ۔ یہاں تک کہ آخری جھاڑی کے پاس سے بھی گذر گیا ۔ وہاں وہ حیران کھڑا تھا

کہ دائیں طرف سے آواز آئی

"کون ہے ؟ سمرم ؟"

سمرم کی باچھیں کھل گئیں اور دائیں طرف بھاگنے لگا۔

آواز دوبارہ آئی "سمرم ! سمرم !!"

سمرم بہت آگے بڑھ گیا۔ وہ مڑا اور اس کی طرف بھاگنے لگا۔ جس طرف سے آواز آئی تھی۔

"کون ہے۔ میری مزینہ !"

"ہاں ——— میں یہاں ہوں ، ادھر آؤ ۔"

اب چاند کی مدھم روشنی میں سمرم کے پہلو میں مزینہ کھڑی تھی۔

"تم ——— مزینہ زندہ ہو ؟ سمرم کے منہ سے نکلا۔

مزینہ کے نتھنے پھولے ہوئے تھے ——— اور وہ سمرم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"یموق نے تجھے چھپا دیا تھا ؟"

"نہیں ، ہرگز نہیں ——— میں خود حیران ہوں کہ اب تک زندہ کیونکر ہوں !"

"جھونپڑی کو جب آگ لگی۔ اس وقت تم کہاں تھیں ؟"

"جھونپڑی کو آگ لگی تھی ؟" مزینہ نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ——— وہ جل کر راکھ ہو چکی ہے ——— بلکہ اب تو اس کی راکھ بھی وہاں نہیں ہو گی ۔"

"عجیب ماجرا ہے ——— میں کچھ بھی نہیں جانتی ——— میں جھونپڑی میں تنہا لیٹی ہوئی تھی کہ دور ایک عورت کو ہاتھ میں خنجر لیے جھونپڑی کی طرف آتے ہوئے دیکھا ، میں نے سمجھ لیا دشمنوں کو ہماری اطلاع مل چکی ہے۔ اس وقت جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکل کر بھاگنا سخت خطرناک تھا۔ اس لیے میں جھونپڑی کے ایک گوشے میں جا کر لیٹ گئی ——— وہ عورت جھونپڑی میں آئی اور کڑک کر بولی۔

"ذلیل عورت تو کہاں بھاگ کر جا سکتی ہے ؟"

"مجھے گھاس کے پیچھے سے راستہ مل گیا —— اور میں دوڑنے لگی۔ ہاں یہ بھی بتا دوں کہ جھونپڑی ہی میں دھوئیں سے میرا دم گھٹنے لگا تھا —— بھاگتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں پوری تیزی کے ساتھ بھاگنے لگی۔ آخر تھک کر اور مایوس ہو کر ان جھاڑیوں میں گھس کر یہاں پہنچ گئی۔ اور اس طرح اپنے دشمن سے محفوظ رہی —— میں تمہیں ہر روز رات کے وقت ڈھونڈتی رہتی تھی اور آج تم مل گئے ہو۔"

سمرم نے غور سے اپنی محبوبہ کا چہرہ دیکھا اور پھر کہنے لگا

"میں جب جھونپڑی کے پاس پہنچا۔ تو وہ دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ میں آگ میں کود پڑا۔ اور ایک قریب الموت عورت کو آگ سے نکالا۔"

"ایک قریب الموت عورت ؟"

"ہاں !"

"کون ؟"

"معلوم نہیں۔"

"عجب راز ہے۔"

دونوں سوچنے لگے۔

(۱۲)

ایک صبح کو سمرم اور مزینہ کسی بعید ترین مقام پر پہنچنے کا ارادہ دل میں لیے چلے جا رہے تھے کہ فضا میں ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا۔ ابھی وہ اس ہنگامہ کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سامنے حمارت مسکراتی ہوئی آئی۔

مزینہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کے قدم رُک گئے۔ سمرم بے خوف و خطر آگے بڑھنے لگا۔ حمارت کے قریب پہنچ کر اس نے وار کرنے کے لیے تیغہ اٹھایا۔ حمارت پیچھے ہٹ گئی۔

"راشے مو!"

سمرم حیرت سے ہنستی ہوئی عورت کو دیکھنے لگا۔

"راشے مو! تم اپنے باپ کی وصیّت کے مطابق ہمارے مالک ہو۔"

پھر شور بلند ہوا۔ آناً فاناً کئی لوگ سمرم اور مزینہ کے گرد ناچنے لگے۔

سمرم بُت بنا کھڑا تھا اور مزینہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔

شور تھم گیا۔ قبیلے کے دونوں سردار آگے بڑھے۔ پہلے ایک سردار نے قبیلے کی رسم کے مطابق اپنے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"سمرم! تمہارا باپ مر چکا ہے۔ اس کی وصیّت یہ ہے کہ میرے بعد میرا بیٹا پجاری بنے۔ ہم اپنے پجاری کی بات کیوں کر رد کر سکتے ہیں؟ تم ہمارے مقدس سردار ہو۔ مقدس راشے کے پجاری ہو۔"

اب دوسرے سردار نے اپنے سر پہ ہاتھ رکھ کر یہی الفاظ کہے۔

سمرم کی مسرت کا یہ عالم تھا کہ اس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلتا تھا۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا

"میں مقدس راشے کی خدمت کروں گا۔"

تمام لوگ ان کے گرد ناچنے لگے۔

(۱۳)

اب سمرم مقدس راشے کا پجاری، یا دوسرے لفظوں میں اس کا قابلِ صد احترام بیٹا بن گیا۔

جس دن یہ واقعہ رونما ہوا اس دن صحرائی قبیلہ صبح سے لے کر رات کے ابتدائی حصے تک ناچتا گاتا رہا۔ سمرم حیران تھا کہ ایک تو وقت تھا کہ اسے اپنی جان بچانے کے لیے ان درندوں سے دور بھاگنا پڑا تھا۔ اور ایک وقت یہ ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے اور تمام لوگ فرطِ عقیدت سے اس کے سامنے سجدے کر رہے ہیں۔

ایک رات جبکہ صحرائی وسعتوں میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی ۔ اور سمرم مقدس راشے کی پرستش کر رہا تھا۔ مزینہ اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی فرطِ مسرت میں جھوم جھوم کر ایک صحرائی گیت گا رہی تھی ۔ اسی اثنا میں وہی کریہہ المنظر بونا عنوؔ آیا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

عنوؔ نے قہقہہ لگایا اور اس کے سر کے زخم سے خون نکل کر ایک لکیر کی صورت میں پیشانی سے گزرتا ہوا اس کی بھدّی ناک کے ایک کنارے پر بہنے لگا ۔ اس چیز نے اس کی مکروہ صورت کو اور مکروہ بنا دیا۔

مزینہ نے منہ پھیر لیا۔ بونا اس کے سامنے آ بیٹھا ۔

"یہاں تمہارا کیا کام ہے ؟" مزینہ نے غصے سے کہا ۔

عنوؔ نے جواب دینے کی بجائے قہقہہ لگایا اور بغیر کسی وجہ کے اپنا سر ہلانے لگا۔

"چلے جاؤ یہاں سے ، مجھے تمہاری مکروہ اور ذلیل صورت سے سخت نفرت ہے ۔"

عنو کا چہرہ قدرے افسردہ ہو گیا ۔ مگر افسردگی چند لمحوں کے لیے ہی قائم رہی اور پھر دُور ہو گئی۔

"میں تمہارا دل بہلانے آیا ہوں ــــ تم تنہا بیٹھی ہو"

"تم ــــ تم میرا دل بہلاؤ گے ؟" یہ کہتے ہوئے مزینہ ہنس پڑی ۔

"میں دنیا کا سب سے مکروہ انسان ہوں ۔" عنوؔ نے کہا۔ خون اس کے ہونٹوں تک پہنچ چکا تھا۔

"تم انسان ہو ــــ ؟"

"تو میں کیا ہوں ؟"

"تمہارے جیسا ذلیل صورت حیوان آج تک پیدا نہیں ہوا ــــ تمہیں چاہیے کہ فی الفور اپنے آپ کو ہلاک کر لو۔ یہ ذلت آمیز زندگی بھی کوئی زندگی ہے ؟"

"میری زندگی ذلت انگیز ہے ــــ ؟"

"ہاں ــــ مر جاؤ ــــ ہر شخص تم سے نفرت کرتا ہے ۔"

"اسی طرح مر جاؤں ــــ بے فائدہ ؟"

"تمہاری زندگی سے کیا فائدہ ——— ؟" مزینہ ہنس پڑی۔

"یہ تمہاری بھول ہے!"

مزینہ نے غصے سے بونے کے لات ماری۔ بونا دونوں ہاتھ ٹیک کر بیٹھا تھا اس حملے سے گر پڑا۔ اور پھر کہنیاں ٹیک کر بیٹھ گیا اور گھور گھور کر مزینہ کو دیکھنے لگا۔

مزینہ سوکھے ہوئے گھاس سے اپنے پاؤں سے لگے ہوئے خون کو پونچھنے لگی۔

"مزینہ تم میری زندگی سے نفرت کرتی ہو۔ کہتی ہو اپنے آپ کو ہلاک کر لو۔ مگر اس بات کو نہ بھولو کہ میں نے ہی تمہاری جان بچائی تھی۔ جانتی ہو کیونکر ——— میں جانتا تھا۔ کہ تم سرم کے ساتھ نمرہ سے بھاگ رہی ہو۔ مگر میں خاموش رہا۔ حمارت نے قبیلے کو بتا دیا۔ کہ تم کھنڈر میں ہو۔ میں اسی وقت کھنڈر میں پہنچا۔ لوگ ابھی آ رہے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ ابھی تم وہیں ہو تو میں نے اپنے تیشے سے خود کو زخمی کر لیا اور ایک طرف لیٹ کر کراہنے لگا۔ لوگ آئے تو میری طرف متوجہ ہو گئے۔ تمہیں بھاگنے کا موقع مل گیا۔"

مزینہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے دوبارہ بونے کے سر پہ لات ماری۔ بونے کا زخم اور پھٹ گیا۔ وہ گر پڑا۔ پھر بیٹھ گیا۔

مزینہ بعجلت وہاں سے چلی گئی۔

بونے نے غصے کے عالم میں گھاس اکھیڑ ڈالا اور پھر نامعلوم کس خیال میں ایک ایک تنکے کو توڑنے لگا۔

(۱۴)

اس دن اتنی شدید تند اور خوفناک آندھی چلی کہ ہر ایک صحرائی باشندہ گھبرا کر اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر آندھی تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔

متعدد جھونپڑیاں گر پڑیں۔ چند ننھے بچے بالسوں کے نیچے دب کر مر گئے۔

نصف سے زائد صحرائی آبادی ایک غار میں جا چھپی اور باقی لوگ بھی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئے۔

سمرم اور مزینہ کی جھونپڑی سب سے مضبوط تھی۔ اس لیے اپنی جھونپڑی کے ایک گوشے میں جاکر ایک دوسرے سے لپٹ کر بیٹھ گئے۔ ابھی آندھی پورے زور پر تھی کہ سمرم کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی پشت پر زور سے ہاتھ مارا ہے۔

اس نے مڑکر دیکھا۔ اس کے پاس گرد و غبار میں اٹا ہوا بونا کھڑا اپنی آنکھوں کو مل رہا تھا۔

"غنو" سمرم نے حیرت کے عالم میں کہا

"سمرم! حمارت نے سرداروں سے کہا ہے کہ راشے ہم پر ناراض ہوگیا ہے، اور ناراض ہوکر ہم کو تباہ کر رہا ہے۔"

"ہاں راشے غضب ناک ہے!"

"مگر حمارت نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ مزینہ اس کی "قربانی" تھی، اور وہ بھینٹ نہیں چڑھائی گئی۔"

سمرم سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گیا۔

"سردار اور تمام لوگ مزینہ کو بھینٹ چڑھانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

"جھوٹ بکتا ہے۔ ذلیل خبیث بونا۔" مزینہ نے کہا اور ایک بھاری لکڑی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔ راشے کی قسم، یہ جھوٹ بکتا ہے۔"

"غنو کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے تمہاری قسم ہے!"

"مقدس راشے کی تم پر لعنت ہو!" سمرم نے کہا۔

"سمرم، مزینہ بھاگ جاؤ ——— وہ خونخوار درخت۔"

"اُف ——— خونخوار!" سمرم نے گھونسہ بونے کے بازو پر مارا۔

"وہ خونخوار درخت ہے۔" بونے نے اپنے پھیپھڑوں کا تمام زور لگا کر کہا۔

"اس نے قبیلے کی بے شمار لڑکیوں کا خون پی لیا ہے۔"

سمرم نے اسے بازوؤں پر اُٹھایا اور جھونپڑی کے باہر آکر اس طرح پھینک دیا

جس طرح ایک وحشی انسان جلی ہوئی لکڑی کو جھنجلا کر پرے پھینک دیتا ہے۔
بُونے نے چلا کر کہا۔
"بھاگ جاؤ ــــ"
سمرم نے نفرت سے اس پر تھوکا اور جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔
آندھی کچھ دیر تھم کر پھر شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔
عنتو اٹھا ــــ اس نے جھونپڑی کی طرف قدم اٹھایا ــــ مگر لڑکھڑا کر گر پڑا۔

(۱۵)

دوسرے دن ہر ایک صحرائی کی زبان پر تھا کہ مزینہ مقدس راشے کی بھینٹ چڑھائی جائے گی۔ کیونکہ یہ اسی کی قربانی ہے۔

سمرم اور مزینہ کے کانوں میں بھی یہ خبر پہنچی۔ اب وہ پچھتائے۔ کہ کیوں نہ بونے کی بات پر اعتبار کر کے اسی وقت بھاگ گئے۔ اب نہ وہ بھاگ سکتے تھے اور نہ کسی طرح اس آفت سے محفوظ ہو سکتے تھے۔

سمرم نے اعلان کیا۔ مجھے مقدس راشے نے کہا ہے کہ مزینہ کو زندہ رکھا جائے اور اس کی بجائے کسی اور کو قربان کیا جائے۔ مگر قبیلے نے کہا کہ مزینہ ہی قربانی ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے مقدس راشے ہم سے ناراض رہے گا۔

سمرم نے یہ بھی کہا۔ کہ ابھی قربانی کا وقت نہیں آیا۔ لیکن لوگوں نے جواب دیا راشے مزینہ کا خون جلد مانگتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ غضب ناک آندھی کیوں چلتی؟

چنانچہ اسی دن قبیلے نے مزینہ پر کڑی نگرانی شروع کر دی۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں بھیڑیئے اور دوسرے جانوروں کی کھالوں سے باندھ دیئے۔ تاکہ وہ حرکت بھی نہ کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ کئی مسلح نوجوان اس کے گرد پہرہ دینے لگے۔

سمرم نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور لہو کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔
اسی تمام حرارت تنہا گزر رہی تھی۔ سمرم نے اُسے بُلایا۔ حرارت کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ

فوراً سمرم کے پاس آئی۔ سمرم اٹھا اور چپ چاپ چلنے لگا۔ حمارت بھی اس کے پیچھے قدم اٹھانے لگی۔

کافی دور جاکر سمرم کھڑا ہوگیا ـــــ اور حمارت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں سمرم!"

سمرم نے اس کے ہاتھ کو زور سے گھسیٹا۔ اور اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ حمارت دھم سے زمین پر گر پڑی۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ نکلا اور وہ تڑپنے لگی۔

"ذلیل عورت! یہ ہے سزا تیری شرارت کی"

حمارت نے خنجر سینے سے نکالا اور اپنے زخم پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سمرم! تو نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مگر میں تجھ پر لعنت نہیں بھیجوں گی ـــــ میں تجھے حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن کوئی اور عورت بھی تجھے حاصل نہیں کر سکتی"

سمرم خاموش کھڑا رہا۔

سمرم اب میں تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میرے پاس بیٹھ جا۔ میں مر رہی ہوں"

سمرم اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں جانتی تھی ـــــ اگر میری تجویز کامیاب نہ ہوئی تو میرا یہی حال ہوگا۔ مگر میری تجویز کامیاب ہوگئی ـــــ پھر بھی دم توڑ رہی ہوں ـــــ سمرم! تو جانتا تھا۔ میں تجھ سے محبت کرتی ہوں اور اس محبت کے لیے سب کچھ کر گزروں گی۔ لیکن تو نے میری طرف توجہ نہ کی ـــــ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ میرے آخری سانس ہیں ـــــ میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں"

حمارت نے دوسرا ہاتھ بھی زخم پہ رکھ دیا۔

"سمرم! میں نے قبیلے کو تمہاری فراری کے متعلق بتایا تھا ـــــ میں نے ہی تعاقب کر کے تجھے ڈھونڈ نکالا تھا اور میں نے ہی اس جھونپڑی کو آگ لگا دی تھی"

"تو نے آگ لگائی تھی؟" سمرم نے انتہائی حیرت سے کہا۔

"ہاں جب میں نے دیکھا کہ مزینہ جھونپڑی میں تنہا ہے تو میں نے اسے ہلاک کرنے کا

ارادہ کر لیا۔ مگر ابھی جھونپڑی میں داخل بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ میری نظر آسنہ پر پڑی۔ جو ادھر آ رہی تھی۔ وہ میری دشمن تھی اور مجھے ہلاک کرنے کے لیے آ رہی تھی، میں ایک طرف ہٹ گئی آسنہ نے سمجھا میں جھونپڑی کے اندر چلی گئی ہوں، وہ جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔

میرے ذہن میں ایک تجویز آئی کہ جھونپڑی کو آگ لگا دوں تاکہ دونوں دشمن ہلاک ہو جائیں۔ چنانچہ میں نے جھونپڑی کو چاروں طرف سے آگ لگا دی۔ اور خود دروازے پر کھڑی ہو گئی کہ کسی کو باہر نہ نکلنے دوں۔"

جھونپڑی دھڑا دھڑ جل رہی تھی کہ میری نظر تم پر پڑی۔ میں دروازے سے ہٹ کر ایک طرف چلنے لگی۔

سمرم! میں سمجھتی تھی کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ مگر اس وقت میری نظر بھاگتی ہوئی مزینہ پر پڑی۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ کہیں چھپ گئی — آخر مایوس ہو کر میں قبیلے میں — آگئی — اب میرے دماغ میں ایک اور تجویز تھی۔ لیکن جب میں نے سنا کہ تمہارے باپ نے وصیت کی ہے کہ تمہیں پجاری بنایا جائے۔ تو میں نے اس تجویز پر عمل کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اب قبیلے کے لوگ تمہارے دشمن نہیں تھے۔ اور نہ مزینہ کے دشمن تھے۔ میں نے لوگوں کو ساتھ لے کر تمہیں ڈھونڈ لیا۔

میرا ارادہ تھا کہ قربانی کا جب وقت آئے تو مشہور کر دوں گی کہ مزینہ راشنے کی قربانی ہے لوگ اسے بھینٹ چڑھا دیں گے۔ یا دو تین جھونپڑیوں کو آگ لگا دوں گی اور کہہ دوں گی کہ راشنے خفا ہو کر یہ سزا دے رہا ہے۔ اس کی "قربانی" زندہ ہے۔

اتفاقاً آندھی چلنے لگی۔ میں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا اور سرداروں سے یہ بات کہہ دی۔ وہ جھٹ مان گئے — او سمرم! — سمرم!! آہ تو نے مجھے ہلاک کر دیا۔ میری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

حمارت رک رک کر سانس لینے لگی۔

سمرم! آخری بات — تمہیں کس نے — میں — یا کہ قربانی —

سرداروں ـــــ میں نے ۔"

" مجھے یہ بات بونے عنّو نے بتائی تھی کہ حمارت نے سرداروں کو مزینہ کی ہلاکت پر آمادہ کیا ہے ـــــ میں نے اس وقت اس کی بات پر اعتبار نہ کیا اور اسے ہلاک کر دیا ۔"

" اسے ہلاک کر دیا ـــــ سمرم ! وہ ـــــ ہلاک ہونے ـــــ والی جنس ـــــ نہیں ۔ وہ اس وقت بھی ـــــ مردہ تھا ـــــ جب ـــــ اس ـــــ اس ذلیل بونے نے میرے ـــــ "

" ہاں سمرم ! یہ بونا ـــــ سخت خطرناک ـــــ یہ مقدس راشے کو کچھ بھی نہیں سمجھتا ـــــ اور مزینہ سے ـــــ "

حمارت نے آخری ہچکی لی ۔ وہ اب مر چکی تھی ۔

(۱۶)

شام کی سیاہی پھیل رہی تھی ۔

لوگ جلدی جلدی کھا پی رہے تھے ۔ کیونکہ رات انھوں نے قربانی دے کر راشے کو خوش کرنا تھا ۔

یکایک فضا میں ایک شور برپا ہو گیا ۔ کہ بونے عنّو نے پجاری کو زخمی کر دیا ہے ۔ لوگ بھاگے بھاگے راشے کے نیچے پہنچے ـــــ اور یک لخت ان کے بدن تھر تھر کانپنے لگے ۔

بونا عنّو مقدس راشے کو کاٹ رہا تھا ۔

فضا میں اتنا شور پیدا ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ۔

چند آدمی ہتھیار لے کر ادھر بھاگے ـــــ عنّو تیزی سے درخت کاٹنے لگا !

درخت جھکتا جا رہا تھا ۔

ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کلہاڑا چھین لیا ۔ عنّو درخت سے چمٹ گیا ۔

ان لوگوں نے پورے زور سے اس کی پشت پر کلہاڑے مارے ۔ دو کلہاڑوں کے

پھل بوٗنے کی پشت کو چیرتے ہوئے درخت پر لگے ــــــ اس کا بقیہ حصہ بھی کٹ گیا۔ اور اسی لمحے میں مقدس راشٹے زمین پر پڑا تھا۔

(۱۷)

چند دن کے بعد ــــــ !

راشٹے دھڑا دھڑ جل رہا تھا ــــــ صحرائی لوگ خوش ہو ہو کر اس کے گرد ناچ رہے تھے ــــــ قبیلے کی لڑکیاں تو اس قدر مسرور تھیں کہ ان کی مسرت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

درخت کی جڑ کے پاس گوشت کے چند لوتھڑے اب بھی نظر آرہے تھے!!

گونگی محبّت

وہ دونوں نوجوان تھیں اور ظاہر ہے کہ جوانی کی بہار آفرینی ہر نسوانی پیکر کے خدوخال میں ایک خاص شگفتگی اور ایک خاص دلآویزی پیدا کر دیتی ہے ——— چنانچہ وہ دونوں حسین بھی تھیں۔ دونوں کے قد بھی قریباً قریباً یکساں تھے۔ دونوں کی عمروں میں بھی کوئی خاص فرق نہ تھا۔ ایک سولہ سال کے قریب ہوگی اور دوسری سترہ یا اٹھارہ کے لگ بھگ مگر اس کے باوجود دونوں میں نمایاں تفاوت تھا۔ ایک کو فطرتاً حق حاصل تھا کہ وہ خوب ہنسے، اور ہر وقت ہنستی رہے۔ اور دوسری دنیا میں صرف اس غرض سے پیدا ہوئی تھی کہ وہ خواہ ہنسے یا روئے لیکن دوسروں کو ضرور ہنسائے۔ ایک اشاروں میں احکام صادر کرتی تھی اور دوسری ان احکام کی بے چون وچرا تعمیل کر دیتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک کی زبان اُس کے منہ میں تھی اور دوسری کی زبان اس کے ہاتھوں کے اشاروں میں!

ایک کا نام تھا اندرا ——— کاغذ کی ایک مشہور فرم کے واحد مالک سیٹھ بدری پرشاد کی اکلوتی لڑکی ——— دوسری کہلاتی تھی جیوتی ——— لیکن یہ نام ایک شخص بھی نہ جانتا تھا۔ آخر ایک گونگی لڑکی کا نام معلوم کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ جس طرح ہر شخص گونگی کے نام سے ناواقف تھا۔ اسی طرح وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے والدین کون تھے۔ اندرا نے دو ایک بار اس کے خاندانی حالات معلوم کرنے کی معمولی کوشش کی۔ مگر جب دیکھا کہ اس سلسلے میں ہر کوشش فضول ہے۔ تو اس نے جانچ پڑتال کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔

کوئی عورت بھی خاص طور پر اپنی خادمہ کے خاندانی حالات معلوم کرنے کے لیے زیادہ تگ ودو نہیں کرتی۔ پھر اندرا کو کیا پڑی تھی کہ وہ اپنی گونگی خادمہ کے حالات دریافت کرے؛ اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کے گھر میں ایک گونگی لڑکی زندگی کے دن گزار رہی ہے۔ جو اس کی خادمہ بھی ہے اور ایک ذریعۂ تفریح بھی ——— !

دونوں کی پہلی ملاقات عجیب انداز میں ہوئی تھی ——— !

ایک دن اندرا کالج سے واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ گلی کے ایک حصّے میں چند عورتیں اور بچے کھڑے ہنس رہے ہیں۔ وہاں پہنچی، تو معلوم ہوا کہ ایک گونگی بھکارن ہجوم میں کھڑی گھبرا رہی ہے۔ جب اندرا نے گونگی کے متعلق کچھ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے والدین بچپن میں فوت ہو گئے تھے اور اب وہ اپنے دور کے ایک رشتہ دار کے ساتھ بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالنے پر مجبور ہے ——— یہ دور کا رشتہ دار ایک بوڑھا تھا جو اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔

اندرا نے بوڑھے سے کہا۔ کہ وہ کسی دن گونگی کو اس کے مکان پر لائے وہ "گونگی" سے باتیں کرنا چاہتی ہے۔

بوڑھا پاگل تھا جو اس زریں موقعے سے فائدہ نہ اٹھاتا؟ وہ دوسرے ہی دن گونگی کو سیٹھ بدری پرشاد کے عالیشان مکان پر لے آیا۔

چند لمحوں کے بعد گھر کے لوگ اس کے اردگرد کھڑے تھے۔

اب گونگی ہے کہ کمرے کی ہر ایک چیز کو بڑی حیرت سے دیکھ رہی ہے اور لوگ ہیں کہ اس کی ہر حرکت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اندرا تو اس کی حرکات سے اس قدر محظوظ ہوئی کہ اس نے بوڑھے سے کہہ دیا:

"اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو گونگی کو یہیں رہنے دو۔ اس کے تمام اخراجات کی ذمّے داری ہم پہ ہوگی۔ تمہارے گزارے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ہر ماہ دے دیا کریں گے۔"

بوڑھے نے یہ بات بخوشی مان لی اور گونگی اندرا کے یہاں رہنے لگی۔

اسے وہاں رہتے ابھی چند ہی ماہ گزرے ہوں گے کہ گھر کی فضا سے پوری طرح مانوس

ہوگئی۔ اب نہ تو اسے اشاروں کے ذریعے اپنے مافی الضمیر بتانے میں کوئی دقت محسوس ہوتی تھی اور نہ گھر والوں کو اس کے اشاروں کا مفہوم سمجھنے میں کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

گونگی میں جہاں خوبیاں تھیں۔ وہاں یہ خصوصیت بھی تھی کہ وہ گھر کے ہر فرد کا دِل وجان سے احترام کرتی تھی۔ یہ خوبی کسی اور خادمہ میں ہوتی تو گھر کے لوگ اس کی بہت قدر کرتے مگر نامعلوم کیا بات تھی کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود گونگی کو —— صرف گونگی ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور گونگی سمجھتے وقت سمجھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے اس کی مضحکہ خیز حرکات ہوتی تھیں، خوبیاں نہیں۔

اندرا اس کی خوبیوں سے کافی متاثر تھی۔ اور جب وہ اس سے باتیں کرتی تو سب کچھ بھول کر اسے محض ایک ذریعۂ تفنن سمجھنے لگتی۔ تاہم گونگی کو اس بات کی کوئی شکایت نہ تھی —— کوئی گلہ نہ تھا۔

(۲)

عام تعلیم یافتہ اور روشن خیال امیرزادیوں کی طرح اِندرا کو بھی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ بالخصوص فنِ مصوری سے۔ اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ کسی اعلےٰ پائے کی تصویر کے حصول میں اگر اسے بڑی سے بڑی رقم بھی صرف کرنا پڑتی تو وہ بے دریغ صرف کر دیتی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے اخبارات میں ایک شاندار نمائش کا اعلان پڑھا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اخبارات میں جو اعلان شائع ہوا تھا۔ اس میں درج تھا کہ نمائش گاہ میں جہاں مرحوم مصوروں کی تصویریں دکھائی جائیں گی۔ وہاں پبلک کو ملک کے موجودہ مصوروں کے خاص کارناموں سے بھی روشناس کرایا جائے گا۔

اس اعلان نے اندرا کے دل و دماغ میں ایک ہیجان بپا کر دیا اور وہ بڑی بے تابی سے دسمبر کے آخری ہفتے کا انتظار کرنے لگی۔

خدا خدا کر کے انتظار کی کٹھن گھڑیاں ختم ہوئیں۔ اِندرا نمائش کے پہلے ہی روز اپنی چند

سہیلیوں اور گونگی کو ساتھ لے کر نمائش گاہ میں پہنچ گئی اور سب سے پہلے اس نے آرٹ گیلری ہی کی طرف قدم بڑھایا۔ اس کی سہیلیاں تو چند منٹ میں کچھ تصویروں کا جائزہ لینے کے بعد کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ مگر اندرا ہر تصویر کو ایسی دلچسپی اور ایسی محویت سے دیکھ رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا شام تک وہ کسی اور چیز کی طرف توجہ ہی نہیں کرے گی۔ یکایک اُسے محسوس ہوا کہ وہ ان تمام تصویروں کو دیکھ چکی ہے جو آرٹ گیلری میں موجود ہیں —— ایک خاص حسرت کے انداز میں اس نے آخری تصویر سے نگاہیں ہٹائیں اور اپنی سہیلیوں کے پاس آبیٹھی۔

ابھی اسے بیٹھے ایک ہی منٹ گزرا ہوگا کہ اس کی سہیلی بولی۔

"تم تو خیر آرٹ کی ہو ہی بڑی دلدادہ۔ لیکن تمہاری گونگی آرٹ کی محبت میں تم سے بھی دو قدم آگے نکل گئی ہے۔"

اندرا حیرت سے اپنی سہیلی کو دیکھنے لگی۔ سہیلی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک کونے میں لے گئی۔ اب اندرا نے دیکھا کہ گونگی بڑی دلچسپی سے ایک تصویر دیکھ رہی ہے۔

"کیوں نہ ہو، آخر ملازمہ کس کی ہے؟" اس کی سہیلی بولی۔

اندرا نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ گونگی کے کندھے پر رکھ دیا۔ گونگی پلٹی اور جس طرح بجھتے ہوئے چراغ کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے اسی طرح اس کی آنکھوں کی روشنی غائب ہونے لگی۔ اندرا نے گونگی کے چہرے سے نظریں ہٹا کر تصویر کو دیکھا —— اور یہ دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، کہ یہ تصویر گیلری کی بہترین تصویر ہے۔ ایسی تصویر اس نے اپنی تمام عمر میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ دل ہی دل میں گونگی کا شکریہ ادا کرنے لگی کہ اس کی وجہ سے وہ ایسی کامیاب تصویر دیکھ رہی ہے۔ ورنہ وہ تو بزعمِ خویش تمام تصویریں دیکھ کر واپس ہی جا رہی تھی۔

اس تصویر میں رنگوں کے نہایت دلآویز امتزاج سے دکھایا گیا تھا۔ کہ ایک اندھی لڑکی ایک نوجوان کے پاؤں پر اس طرح گر پڑی ہے۔ کہ اس کی باہیں اپنے محبوب کی

ٹانگوں کے گرد حمائل ہو گئی ہیں۔

تصویر کے نیچے لکھا تھا۔" ایک راز کا انکشاف !"

اس تصویر نے اندرا کو بہت متاثر کیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ مصوّری کے اس بے نظیر نمونے کو ہر وقت دیکھتی رہے ——— ہر گھڑی دیکھتی رہے۔ آخر اس نے نمائش گاہ کے منتظم سے مصوّر کا نام اور پتہ پوچھا اور گھر روانہ ہو گئی۔

ایک ہفتے کے بعد ایک نوجوان جس کے لباس سے غربت ٹپک رہی تھی اندرا کے سامنے کھڑا تھا۔

"کیا آپ کا نام دیپک ہے۔ اور آپ ہی نے وہ تصویر بنائی ہے جس کا نام ہے "ایک راز کا انکشاف ؟" اندرا نے پوچھا۔

"جی ہاں! میرا ہی نام دیپک ہے۔ قدرہ نوازی کا شکر گزار ہوں۔ میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص نے بھی اس تصویر کو خریدنا تو ایک طرف رہا اس کی تعریف میں بھی دو لفظ نہیں کہے۔ میں مایوس ہو چکا تھا۔ مگر اب یہ دیکھ کر کہ میرے آرٹ کے بھی قدر دان موجود ہیں۔ میری ہمت بندھ گئی ہے ——— غالباً آپ نے نمائش گاہ کے منتظم سے تصویر خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔" مصوّر نے سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

"ہاں میں اس تصویر کو خریدنا چاہتی ہوں۔ مگر منتظم سے نہیں خریدوں گی۔ اگر آپ اسے اپنی توہین نہ سمجھیں تو عرض کر دوں کہ یہ تصویر میں براہِ راست مصوّر سے حاصل کرنے کا شرف حاصل کروں گی۔"

فرطِ مسرت سے مصوّر کا چہرہ سرخ ہو گیا

"ہاں میں ایک بات اور پوچھنا چاہتی ہوں۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ مجھے فن، مصوّری سے بڑی دلچسپی ہے۔ آج تک تصویروں کو فراہم کر کے اپنا شوق پورا کرتی رہی۔ اب میری آرزو ہے کہ خود بھی کاغذ کو داغدار بنانے کی کوشش کیا کروں ——— اگر آپ کو عذر نہ ہو تو پتاجی سے دریافت کر لوں ؟"

"میں آپ کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ معاف کیجئے گا۔" مصوّر نے گھبراہٹ میں کہا۔

"آپ سمجھ گئے ہیں ــــــ فنِ مصوّری میں آپ میرے استاد ہوں گے۔"

"مجھے اس میں کوئی عذر نہیں!"

"تو چلئے پتاجی کے پاس!" اندرا نے مسکرا کر کہا۔

بھلا سیٹھ بدری پرشاد اپنی اکلوتی لڑکی کی خواہش کو رد کر سکتا تھا؟

(۳)

مصوّر دیپک ہر روز وقتِ مقررہ پر کوٹھی میں آتا اور اپنا فرض پورا کر کے چلا جاتا ــــــ کئی ہفتے گزر گئے اور اس مدت میں بے تکلفی تو رہی ایک طرف اس نے بغیر کسی شدید ضرورت کے کسی سے بات بھی نہ کی۔ اس کے باوجود کوٹھی میں ایک ایسی ہستی بھی موجود تھی۔ جو کسی نہ کسی حد تک اس سے بے تکلف ہو گئی تھی ــــــ یا بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔ اور وہ تھی جیوتی۔

دیپک، جیسا کہ ایک مصوّر کو ہونا چاہیئے، بہت سنجیدہ انسان تھا تاہم جب گونگی اس کے سامنے آ کر عجیب عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگتی، تو وہ بے اختیار ہنس پڑتا۔ اور گونگی بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگتی۔

اندرا کو جب کام سے فرصت مل جاتی اور دیپک بھی فارغ ہو جاتا تو دونوں دیر تک گونگی کے اشاروں سے لطف اٹھاتے رہتے۔ گونگی کے قہقہوں سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ یہ قوتِ گویائی سے محروم ہستی اپنی محرومی و بے چارگی کو یکسر فراموش کر چکی ہے ــــــ اسے اپنے گونگے پن کا ذرّہ برابر بھی افسوس نہیں ہے۔ اور اس پر اندرا اور دیپک دونوں اظہارِ حیرت کرتے رہتے۔

گونگی کے سپرد گھر کے کئی کام کاج تھے۔ تاہم وہ دیپک کی آمد سے پیشتر تمام فرائض سے عہدہ برآ ہو کر اندرا کے کمرے میں پہنچ جاتی اور جب تک دیپک وہاں رہتا چپ چاپ کوچ پر بیٹھی رہتی۔

دیپک کئی روز سے ایک تصویر بنا رہا تھا۔ اور اس تصویر کا موڈل تھی اندرا۔ جب تصویر مکمل ہو گئی تو گونگی بھی اپنی تصویر کی آرزو کا اظہار کرنے لگی۔

گونگی کئی روز سے اپنی آرزو کا اظہار کر رہی تھی —— جب دیپک آتا تو وہ اس کے سامنے سٹول پر بیٹھ کر اس طرح خاموش ہو جاتی گویا وہ موڈل ہے اس پر اندرا بھی ہنس پڑتی اور دیپک بھی!

انہی دنوں اچانک اندرا کی طبیعت علیل ہو گئی۔ اب دیپک کا کام یہ تھا کہ دن کے کسی حصے میں اندرا کے یہاں آئے اور اس کی حالت دیکھ کر واپس چلا جائے۔

جیوتی ایک طرف تو رات کے دو دو بجے تک اپنی مالکہ کی خبر گیری کرتی رہتی تھی۔ اور دوسری طرف نامعلوم کیوں اس کی فطری شوخی غائب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب بھی ہنستی تھی مگر یہ ہنسی پھیکی پھیکی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اب بھی دیپک کے ساتھ اشاروں میں باتیں کرتی تھی۔ لیکن ایک جھجک —— ایک خاص ہچکچاہٹ کے ساتھ!

بعض اوقات رات کو اندرا کی آنکھ کھل جاتی تھی تو وہ دیکھتی تھی کہ جیوتی کوچ پر بیٹھی یا فرش پر پڑی ہوئی انگیٹھی کی چنگاریوں کو ایک خاص محویت کے ساتھ دیکھ رہی ہے۔ اس نے گونگی سے اس محویت کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی۔ مگر اول تو گونگی اپنی مالکہ کا مفہوم ہی نہیں سمجھ سکتی تھی اور اگر سمجھتی بھی تھی تو ذرا مسکرا کر خاموش ہو جاتی تھی!

ایک دن اندرا نے دیپک سے کہا

"شاید ہماری گونگی ہم سے ناراض ہے۔ دیکھئے تو آج کل کچھ خاموش اور افسردہ سی رہتی ہے۔ اس کی تصویر بنا دیجئے نا!"

"بس اسی بات پر خفا ہو گئی ہے؟" دیپک نے ہنس کر کہا اور دوسرے دن جب وہ آیا۔ تو جیوتی کا ہاتھ پکڑ کر اسے سٹول کی طرف لے گیا۔ جیوتی سمجھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی —— ایک ایسی چمک جو بجھتی ہوتی چنگاری کے ایک دم روشن ہو جانے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں چمک دور ہو گئی۔ دیپک نے دیکھا کہ گونگی بصورتِ انکار اپنا سر ہلا رہی ہے۔ دیپک نے بہتیری کوشش کی کہ وہ سٹول

پر بیٹھی رہے۔ لیکن گونگی اپنی ضد پر بدستور قائم رہی۔

اندرا کہنے لگی ——— "بیچاری کئی روز سے کہہ رہی تھی میری خوبصورت تصویر بنا دو۔ مگر آپ نے توجہ ہی نہ کی ——— خفا نہ ہو جاتی تو اور کیا کرتی؟"

اندرا نے یہ الفاظ بڑی ہمدردی سے کہے۔ دیپک بولا۔ "اس کی خوبصورت تصویر کا تو ذکر کیا یہ خود بھی خوبصورت ہے۔ اگر بے چاری گونگی نہ ہوتی تو نہ معلوم کتنی نگاہوں کا مرکز بن چکی ہوتی۔"

اندرا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

دوسرے دن جیوتی خاص طور پر افسردہ تھی۔ اندرا نے اسے خود سٹول پر بٹھا دیا ——— یک لخت گونگی کا چہرہ شگفتہ ہو گیا اور وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی

جیوتی کی تصویر بننے لگی۔

جب تک وہ سٹول پر بیٹھی رہتی تھی۔ ایسی حرکتیں کرتی رہتی تھی گویا بہت پریشان ہے ——— دو تین دن کے بعد اس کی طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا۔ اور اب وہ دیپک کے منع کرنے کے باوجود اس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی تھی۔

تصویر مکمل ہو گئی ——— اپنی تصویر دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

چند ہفتے گزر گئے اندرا صحت مند ہو کر دیپک کی زیر ہدایت کوئی نئی تصویر بنانے لگی۔

جیوتی کی طبیعت میں پھر تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ اب وہ پھر ہر وقت پریشان نظر آتی تھی۔ پہلے اس سے مضحکہ خیز حرکتیں ہوتی تھیں تو وہ دوسروں کے ساتھ خود بھی ہنس پڑتی تھی۔ اب بھی وہ اس قسم کی حرکتیں کرتی تھی۔ مگر اس کی حرکتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کھوئی کھوئی سی، پریشان پریشان سی ہے۔

گھر میں اس کی افسردگی کے متعلق دو وجوہ پیش کئے جاتے تھے۔ دیپک کا خیال تھا کہ اسے اپنے والدین اور رشتہ داروں کی یاد ستا رہی ہے۔ اور اندرا کا خیال تھا کہ اب اُسے اپنی بے چارگی کا شدید احساس پیدا ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر گھڑی غمگین دکھائی دیتی ہے۔

ایک دن جیوتی اندرا کے ڈرائینگ روم میں جاکر دیپک کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ یکایک ایک ہاتھ اس کے شانے پر لگا۔ اس نے مڑکر دیکھا اور بے اختیار ہوکر دیپک کے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا۔

دیپک نے قہقہہ لگاکر کہا "ڈر گئی ہے بے چاری"

"دیکھ کیا رہی تھی —— ؟" اندرا نے پوچھا —— تمہاری تصویر —— پگلی ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ کل اپنی تصویر دیکھ رہی تھی"

"آخر اس کی پریشانی کی وجہ کیا ہے ؟"

"میں خود بھی نہیں جانتی ——!" اندرا نے جواب دیا۔ جیوتی چلی گئی۔

"اندرا! اس کے باوا کو ڈھونڈو —— ممکن ہے اس کی جدائی میں مغموم ہو"

دونوں کمرے سے باہر نکل آئے —— جیوتی دیوار سے لگ کر کھڑی تھی اور انگوٹھے کے ناخن سے چونا کھرچ رہی تھی!

(۴)

گونگی نے بہت کوشش کی۔ کہ اپنے دل سے اس خوفناک جذبے کو نکال دے۔ جس کا زہر لمحہ بہ لمحہ بکھرتا چلا جارہا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اس کا معصوم دل اور اس کا دماغ جن زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ ان زنجیروں کو توڑنا اُس کے بس کی بات تھی۔ وہ رات کو بستر پر لیٹتی تو دل میں عہد کرلیتی کہ اب صبح ہرگز اندرا کے کمرے میں نہیں جائے گی —— اب ہرگز دیپک کی صورت نہ دیکھے گی۔ مگر جب صبح ہوتی تو ایک جذبۂ بے اختیار اسے کشاں کشاں اس جگہ لے جاتا۔ جہاں ٹنگی ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں اسے اس طرح سے مسحور کرلیتیں، جس طرح سانپ کی آنکھیں پرندے کو مسحور کرلیتی ہیں۔ اس کا ہر ارادہ دم توڑ دیتا۔ اس وقت اس کی حالت اس پرندے کی سی ہوجاتی جس کے پر شکستہ ہوں۔ اور جو انتہائی بے چارگی کے عالم میں دور درخت کی ایک شاخ پر اپنے آشیانے کو دیکھ رہا ہو۔

اس کی زبان گونگی تھی مگر دل تو گونگا نہیں تھا اور اس کے دل کی زبان اس کی گونگی

زبان سے نہ معلوم کیا کچھ کہتی رہتی تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ اپنے خوبصورت جادوگر کے سامنے آتی آئیں بائیں کے سوا اس کی زبان سے کچھ بھی نہ نکلتا۔

دیپک ہنس پڑتا اور گونگی کے سینے کا شعلہ اور بھی بھڑک اُٹھتا۔

کئی بار اس نے تنہائی میں اپنے محبوب کے سامنے اپنی زندگی کے سب سے بڑے راز کو منکشف کرنا چاہا ——— اور جب کبھی اس نے ایسی کوشش کی تو اس کی بے معنی آواز دیپک کے قہقہوں سے ٹکرا کر ہوا کی گود میں دفن ہوگئی۔

(۵)

گونگی سوچتے سوچتے جھنجھلا اُٹھتی ——— جھنجھلا جھنجھلا کر پھر سوچنے لگتی۔ وہ اپنے دل کا راز کیونکر اپنے محبوب پر ظاہر کرے؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی تمنّا یہ تھی۔ کہ اسے ایک لمحے ——— بس ایک لمحے کے لیے زبان مل جائے۔ اور اس ایک لمحے میں اپنے محبوب کو سب کچھ بتا دے۔ لیکن اس کی آرزو ایک گونگی کی آرزو تھی ——— ایک قوتِ گویائی سے محروم عورت کی آرزو۔ اس نے آنکھوں سے، ہاتھ کے اشاروں سے اپنے دل کی بات بتانے کی کوشش کی۔ لیکن کون سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے ——— کون جان سکتا تھا کہ وہ کیا بتا رہی ہے؟

چند دن سے اس کی بیتابی میں اضافہ ہوگیا تھا وہ پہلے سے بڑھ کر مضطرب ہوگئی تھی۔ اور ایک دن اندرا نے حیرت سے دیکھا کہ وہ برش سے کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ رہی ہے اور دیپک نے تعجّب سے دیکھا کہ وہ بڑی سنجیدگی سے اپنے جنون کا ساتھ دے رہی ہے۔

کئی دن گزر گئے ——— کئی ہفتے گزر گئے ——— اب گونگی کا برش انسانی شکل بنانے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ وہ دیپک کی تصویر کو اپنی خوابگاہ میں لے گئی۔ جہاں اس کی اپنی تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ وہی تصویر تھی جسے دیپک نے بنایا تھا اور جو جیوتی کو بے حد عزیز تھی۔

کئی اور ہفتے گزر گئے ـــــ اب گونگی کا جنون ایک تصویر میں منتقل ہو چکا تھا۔
تصویر میں دیپک کھڑا تھا اور جیوتی اس کے پاؤں پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اس کی دونوں بانہیں دیپک کی ٹانگوں کے گرد حمائل ہو گئی تھیں۔

گونگی نے اپنے کارنامے پر نگاہیں ڈالیں اور خود بخود شرمندہ ہو گئی۔

گونگی کا کام ختم ہو چکا تھا لیکن ابھی اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ دیپک اپنے شہر میں تھا اور جیوتی اس کی آمد کا انتظار کرنے لگی تھی۔

دیپک آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی گونگی کا دِل دھڑکنے لگا ـــــ وہ اپنی خوابگاہ میں چلی گئی ـــــ اس نے تصویر اٹھائی اور بھاگ کر باغیچے میں جا کھڑی ہوئی۔

کافی وقت گزر گیا اور ابھی دیپک کمرے ہی میں تھا۔

جیوتی نے تصویر کو پودے کے سامنے رکھ دیا۔ اور خود اندرا کے کمرے کی طرف آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگی۔

ایک دو منٹ کے بعد وہ اِندرا کے کمرے کی دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا اور یکایک اس کی آنکھوں کے تلے اندھیرا چھا گیا۔

اندرا اور دیپک ـــــ دیپک اور اندرا ـــــ دیپک کے بازو اندرا کی گردن میں حمائل اور اندرا کے ہاتھ دیپک کے سینے پر!

گونگی ایک لمحہ کے لیے بھی وہاں کھڑی نہ رہ سکی ـــــ باغیچے کی طرف جانے لگی اور پودے کے قریب پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر نشتر کی طرح ایک خیال اس کے دل میں چبھا۔ اس نے تصویر نکالی اور اسے پُرزے پُرزے کر کے ہوا کی لہروں کے سپرد کر دیا ۔ دیپک آیا ـــــ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ گونگی نے اسے دیکھا اور اس طرح کھڑی ہو گئی جیسے پتھر کی بے جان مورتی ہو۔

دیپک کاغذ کے پرزوں پر قدم رکھتا ہوا چلا گیا۔

(۶)

جلتے ہوئے چراغ میں سے ایک دم تیل نکال دینے سے چراغ کی جو کیفیت ہوتی ہے

وہی کیفیت جیوتی کی ہوئی۔ اس کی تمام اُمیدیں، تمام آرزوئیں خاک میں مل گئی تھیں۔ اس کے من کا دیپک بجھ چکا تھا۔ تاہم اس نے اپنی تمام تر توجہات گھر کے کاموں پر مرتکز کر دیں۔ وہ صبح سے لے کر شام تک ایک مشین کی طرح کام کرتی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ ہر وقت کام کرتی رہے۔

آہستہ آہستہ اس کی طبیعت میں کچھ تبدیلی سی پیدا ہونے لگی۔

اندرا کی منگنی دیپک سے ہوگئی اور چند روز کے بعد شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جیوتی ایک وفادار خادمہ کی طرح شادی کی تیاریوں میں حصّہ لینے لگی۔

ایک دن اندرا اور دیپک اس "رشتے" میں منسلک ہوگئے جس "رشتے" کو دنیا شادی کہتی ہے۔ چونکہ دیپک ایک غریب مصوّر تھا اس لیے سیٹھ بدری پرشاد نے اپنی بیٹی اور داماد کو اپنے بنگلے میں رہنے کی اجازت دے دی۔

"اندرا گونگی کو اپنے لیے بہت بڑا ذریعۂ تفریح سمجھتی تھی۔ اس لیے وہ گونگی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے لگی۔

گونگی نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ مگر اندرا کے سامنے اس کے انکار کی کیا حقیقت تھی۔

تینوں ہستیاں شہر کے باہر ایک شاندار بنگلے میں چلی گئیں۔

(۷)

کچھ دیر کے لیے گونگی کی طبیعت میں سکون پیدا ہوگیا تھا۔ مگر یہ سکون سمندر کے اس سکون کی مانند تھا جو ایک قیامت خیز اور خوفناک طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کا دل ہر وقت بے چین رہتا تھا اور اس کا دماغ ہر لمحہ ایک کشمکش میں گرفتار ــــ!

وہ کوشش کرتی کہ یہ بے چینی دور ہو جائے اس کے دماغ کو اس کشمکش سے نجات مل جائے۔ لیکن نہ تو وہ بے چینی دور ہوئی اور نہ کشمکش سے نجات ملی۔

کام کرتے وقت یا دل کو سمجھاتے وقت وہ سمجھ لیتی کہ اس کے دل کا زخم ہمیشہ کے لیے

منتقل ہو گیا ہے۔ مگر جیسے ہی اس زخم میں ایک ٹیس اُٹھتی، وہ پریشان ہو جاتی۔ اور یہ پریشانی اس کے زخم میں نشتر سا چبھو کر زخم کو اور گہرا کر دیتی۔

ایک دن اس نے گھر سے بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا وہ یہ ارادہ لے کر دروازے تک گئی۔ —— اچانک دیپک کا چہرہ نظر آ گیا۔ اور وہ اس طرح لوٹ آئی جس طرح دریا کی لہر ساحل پر پڑی ہوئی کسی چیز کو بہا کر لے جائے —— دُور —— اور دُور!

اس کے دل میں ہر وقت جذبۂ محبت اور جذبۂ خوف کے درمیان ایک کشمکش سی جاری رہتی تھی۔ کبھی تو خوف کا کثیف بادل محبت کی آگ پر اس طرح چھا جاتا کہ جیوتی اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیتی اور بھاگ جانے پر تیار ہو جاتی۔ اور کبھی یہ آگ اس طرح بھڑک اٹھتی کہ خوف کا بادل اس کے شعلوں پر دھوئیں کی باریک سی چادر بن جاتا۔

کب تک ضبط کرتی۔ اضطراب اور بے چینی کی چند لہریں اٹھیں اور اس کا سکون و ضبط تنکوں کی طرح بہا کر لے گئیں۔

جب کبھی وہ کمرے میں تنہا ہوتی اور سمجھتی کہ مالکہ دوسرے کمرے میں کام کر رہی ہے تو وہ دیپک کی قمیص کو سینے سے لگا کر زور زور سے بھینچنے لگتی۔

ایک دن وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے دیپک کی تصویر پڑی تھی۔ جسے وہ آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے لرزتی ہوئے ہاتھوں سے فوٹو کو اٹھایا اور اسے آنکھوں کے بہت قریب لے آئی۔

آنسوؤں نے اس کی آنکھوں پر اس طرح نقاب ڈالی ہوئی تھی کہ وہ اپنی مالکہ کو بھی نہ دیکھ سکی جو اس کی دائیں جانب کھڑی اس منظر کو سخت حیرت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔

اندرا آج تک اس قدر حیران نہیں ہوئی تھی۔

وہ چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔ اس کے دل میں کانٹا سا چبھنے لگا —— آخر یہ کیا معمّہ ہے؟ گونگی کو ہو کیا گیا ہے آج؟ پاگل ہو گئی ہے —— پاگل —— ! اس نے میرے فوٹو کو کیوں نہیں دیکھا؟ خاص طور پر دیپک کے فوٹو کو کیوں دیکھ رہی ہے؟

اندرا اس دن شام تک انہی خیالات میں غرق رہی۔

ایک دن بارش ہو رہی تھی ۔ جیوتی کسی کام کی غرض سے صحن میں سے گزر رہی تھی ۔ کہ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھم سے زمین پر گر پڑی ۔ دیپک بھاگ کر اس کی طرف گیا اور اُسے بیہوشی کی حالت میں اٹھا کر کمرے کی طرف لے جانے لگا ۔

"بے چاری بے ہوش ہو گئی ہے ۔" دیپک نے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا ۔

بیوی نے دیکھا کہ گونگی کی باہیں اس کے شوہر کی گردن میں حمائل ہیں ۔

"چارپائی پر لٹا دیجئے !" اندرا نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا ۔

"لٹاؤں کیسے ؟ دیکھو تو بے چاری کا کیا حال ہے ؟"

اندرا نے گونگی کی باہنوں کو زور سے جھٹکا دیا ۔ بے ہوش عورت نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ آنکھیں کھول دیں ۔

دیپک نے اسے چارپائی پر لٹا دیا اور اپنی بیوی پر خفا ہونے لگا کہ اس نے جیوتی کی باہنوں کو جھٹکا دے کر اسے ڈرا دیا تھا ——— واقعی اس وقت گونگی کی حالت ایک خوفزدہ ہرنی کی سی تھی ۔

اس کے بعد جیوتی کی طرف سے اندرا بدگمان ہو گئی ——— اس کا رویّہ یکسر بدل گیا ۔ وہ بات بات پر جیوتی کو برا بھلا کہنے لگتی ۔ بلکہ بعض اوقات فرطِ غم و غصہ میں اسے تھپڑ بھی لگا دیتی ۔

ایک دن اس نے گونگی کی پسلی پر زور سے لات ماری ۔ گونگی درد سے بلبلا اٹھی پھر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی اور چارپائی پر گر پڑی ۔

صبح اندرا اور دیپک نے دیکھا کہ گونگی بنگلے میں نہیں ہے ۔

دیپک حیران تھا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے ——— اور اندرا مطمئن کہ بلا سے نجات مل گئی ہے ۔

(۸)

گھر سے نکل کر گونگی حیران تھی ، کہ کدھر جائے ، کہاں جائے ۔ اس نے چاہا کہ پھر گداگری

کر کے گزارہ کرے لیکن اب یہ اس کے بس کا روگ نہ تھا اس نے چاہا کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے ـــــــ لیکن ابھی وہ دریا سے کچھ دور ہی تھی کہ بھوک اور پیاس کی شدت سے بیہوش ہو کر گر پڑی۔ اتفاق سے گاؤں کے زمیندار کی لڑکیاں گاڑی میں بیٹھ کر ادھر سے گزر رہی تھیں، انہوں نے ایک عورت کو بے ہوش دیکھا تو ازراہِ رحم اس کے پاس گئیں اور اسے ہلانے لگیں۔ گونگی نے آنکھیں کھول دیں۔

لڑکیوں نے اسے بہتیرا بلایا۔ لیکن وہ انھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔

لڑکیاں اسے گاؤں لے گئیں۔ شام کے وقت کہیں جاکر گونگی نے اشارے کئے ـــــــ گھر والوں نے سمجھ لیا کہ بے چاری گونگی ہے ـــــــ گونگی اب وہیں رہنے لگی۔

(۹)

دیپک پر ایک خوفناک بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ جس نے اس کے چہرے کی تمام خوبصورتی چھین لی۔ اب وہ چند قدم بھی چلتا تھا تو اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی تھیں۔

اندرا کو کبھی خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس کا حسین شوہر اس قدر بد صورت ـــــــ اس درجہ کریہہ المنظر ہو جائے گا۔ شدید بیماری نے دیپک کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا اور یہ چڑچڑاپن اندرا کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ ہر روز ان دونوں میں تکرار ہوتی تھی۔ اسی طرح اندرا کے دن گزر رہے تھے۔

دیوالی کی رات تھی۔ اندرا کا بچہ کھلونوں کے لیے ضد کرنے لگا۔ اندرا اور دیپک دونوں بچے کو ساتھ لے کر بنگلے سے نکل آئے ـــــــ زمیندار کی لڑکیاں بھی گونگی کو ساتھ لے کر بازاروں میں گھوم رہی تھیں۔ گونگی ان کے پیچھے پیچھے چیزیں اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ کہ اس کی نظر اندرا پر پڑی۔ پھر اندرا کے چہرے سے ہٹ کر دیپک کے چہرے پر ـــــــ!

حیرت سے اس کی آنکھ کی پتلیاں پھیل گئیں۔

اس نے اپنی آنکھوں کو دو تین بار ملا۔ مگر اس کے سامنے دیپک ہی کھڑا تھا۔

گونگی کے دل میں بیسیوں نشتر چبھ گئے۔ زمیندار کی لڑکیاں تو ہنستی ہوئی آگے نکل گئیں۔ اور

انھیں گونگی کی اس وقت خبر ملی۔ جب وہ ٹانگے کی لپیٹ میں آکر زخمی ہو چکی تھی۔

(۱۰)

گونگی پہلے سے بڑھ کر بے تاب ہو گئی۔ اس کے دل کا زخم جس کی خونفشانی بند ہو گئی تھی — اب پھر پھٹ گیا تھا —— اس کا محبوب شدید بیمار ہے یہ خیال ایک لمحے کے لیے بھی اُسے نہ بھولتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی بے قراری کم نہ ہوتی تھی۔ وہ کوئلے سے دیواروں پر دیپک کی تصویر بناتی تھی اور پھر اسے مٹا دیتی تھی۔

ایک طوفانی رات تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جسم خراش جھونکے شور پیدا کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ وہ بے قرار ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ اسے خود بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس وقت اسے ہوش آیا جب وہ لالٹین اٹھائے تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔

بارش —— چیختے ہوئے تیز، تند اور ہڈیوں میں شگاف کرتے ہوئے ہوا کے تیز جھونکے —— گونگی تیزی سے قدم اُٹھا رہی تھی۔

ایک جگہ وہ دھم سے گر پڑی۔ اُس کی ٹانگوں پر کئی زخم آئے —— اور پاؤں خون آلود ہو گئے۔ مگر وہ ایک کراہ کے ساتھ پھر اٹھی اور زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔ آخر بنگلے کے قریب پہنچ گئی۔

(۱۱)

دیپک اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ تنہا تھا اور شدید بیمار۔ بیوی ناراض ہو کر میکے چلی گئی تھی۔

یکایک اس نے قدموں کی چاپ سُنی۔ وہ بجلی کا بٹن دبانے کے لیے اُٹھا ابھی اس کا ہاتھ بٹن تک نہیں پہنچا تھا کہ فرطِ ضعف سے گر پڑا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ہڈیاں پیس دی گئی ہیں۔

فضا میں آں واں کی سی آوازیں آنے لگیں۔ دیپک نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ روشنی ——

اور پھر گونگی کا چہرہ ــــــ!

"جیوتی ــــ!" دیپک نے حیرت سے کہا۔ "تم یہاں جیوتی؟"

جیوتی آگے بڑھ آئی۔ اس کے لالٹین کھڑکی کے قریب رکھ دی ــــــ دو تین لمحے خاموش ــــ ساکت کھڑی رہی اور پھر بے اختیار ہو کر اس نے دیپک کے ہاتھ پکڑ لیئے۔

ہوا کے تند جھونکوں سے کھڑکی کھل گئی۔ لالٹین دوسری طرف جا گری۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔

بجلی چمکی ــــ جیوتی نے اپنے محبوب کے چہرے کو دیکھا ــ اس کے ہونٹ ہلے ــــ اور فضا میں ایک آواز پیدا ہوئی۔ "دی۔ پک"

دوسرے لمحے میں گونگی کی ٹانگیں لڑکھڑائیں اور دھم سے گر پڑی۔

(۱۲)

صبح اندرا ہزاروں شکوے اور شکایتیں لیے ہوئے بنگلے میں داخل ہوئی۔ اور جلدی جلدی قدم اٹھاتی دیپک کے کمرے میں آگئی۔

وہاں پہنچتے ہی ــــ حیرت سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

دیپک فرش پر پڑا تھا ــــــ جیوتی بھی گری پڑی تھی۔ اور اس کی دونوں بانہیں دیپک کی ٹانگوں کے گرد لپٹی ہوئی تھیں ؂

اَن داتا

چند ٹوٹی پھوٹی، بوسیدہ اور بدنما جھونپڑیاں ——— چند پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس مفلوک الحال مگر ہشاش بشاش انسان، چند مریل، نحیف و نزار لیکن شب و روز محنت کرنے والے گدھے ——— بستی کے قریب مٹی کے بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے تودے ——— اور درختوں کی ایک قطار کے قریب بہتی ہوئی شفاف اور تیز رو ندی ——— یہ تھی کل کائنات خداداد بستی کی۔

خداداد بستی کہنے کو تو ایک بستی تھی۔ مگر یہاں کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی۔ جو عام طور پر بستیوں میں پائی جاتی ہے ——— باوجودیکہ یہاں تیس چالیس انسان زندگی بسر کر رہے تھے لیکن علاقہ اس قدر بنجر، اتنا ویران نظر آ رہا تھا کہ آس پاس کے گاؤں کا گنوار سے گنوار شخص بھی یہاں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کئی مرتبہ دیہات کے لوگوں نے چاہا کہ اس ویرانے کو آبادی میں تبدیل کر دیں۔ چنانچہ وہ اس مقصد کے زیر اثر یہاں پہنچے بھی۔ چند دن تک اِدھر اُدھر گھوم کر مکان بنانے کے لیے زمین بھی تلاش کرتے رہے ——— اور چند آدمیوں نے باقاعدہ طور پر یہاں رہائش بھی اختیار کر لی۔ لیکن یہ تماشا بہت جلد ختم ہو گیا ——— دیہات کے جاہل اور گنوار لوگ بھی خداداد بستی میں سانس لینے والے انسانوں کو محض جنگلی اور حیوان ہی سمجھتے تھے۔ ان کے مکان تمام کے تمام منہدم ہو چکے تھے۔ اور اب ان کی بجائے اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ جنھیں خداداد بستی کے باشندے کبھی کبھی مسکرا کر دیکھ لیا کرتے تھے۔

خداداد بستی کے لوگوں کے لیے یہاں کی مٹی ہی سب کچھ تھی ——— مٹی جسے یہ لوگ اپنے گدھوں پر لاد کر شہروں میں لے جاتے تھے اور اس کے عوض آب و دانہ لے آتے تھے!

عام طور پر وہ مٹی لاد کر صبح کے دھندلکے میں جاتے تھے اور دن ڈھلتے واپس آجاتے تھے ——— مرد گھر سے چلے جاتے تھے تو عورتیں چکی پیستی تھیں، کپڑے سیتی تھیں اور گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔

بظاہر گدھوں پر مٹی لاد کر شہر میں جانا معمولی سا کام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خاص قسم کی مٹی حاصل کرنے میں انھیں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ——— ایسی دشواریوں کا سامنا جو عام شہری لوگ محسوس ہی نہیں کر سکتے!

بعض اوقات عمدہ مٹی حاصل کرنے میں ان کے بازوؤں اور کدالوں کو پورا پورا دن حرکت کرنا پڑتی تھی۔ جب کہیں جا کر وہ مٹی کی خاص مقدار حاصل ہوتی ——— اور پھر یہ بھی بات ہے کہ شہر کے لوگ اتنی محنت اور مشقت سے نکالی ہوئی مٹی کو ——— صرف مٹی ہی سمجھتے تھے اور اسے چند سکوں کے عوض خریدنا بھی ان کے لیے ایک تکلیف دہ امر تھا۔ ان کو کیا معلوم کہ اس مٹی کے لیے انسانوں نے کڑکتی دھوپ میں اپنا لہو پسینہ بنا کر بہا دیا ہے۔

خداداد بستی کے مرد بھی محنتی تھے اور عورتیں بھی۔ مردوں کو جب کبھی فرصت ملتی تو وہ ندی کے پار جا کر ایک ماہر انجنیئر کی طرح زمین کا جائزہ لینے لگتے اور عورتوں کو گھر کے کاموں سے نجات ملتی تو وہ اس وقت چرخہ کاتنے میں مصروف رہتیں۔ جب تک اُن کے مرد اور بیٹے اپنی مخصوص ذمے داری سے عہدہ برآ ہو کر واپس نہ آجاتے۔ جب وہ آ جاتے تو پھر عورتیں معمول کے مطابق گھر کے کاموں میں منہمک ہو جاتیں۔ سوائے رات کے ان کی زندگی میں کوئی وقت بھی ایسا نہ تھا جب ان کے اعضاء حرکت نہ کرتے ہوں۔

وہ کام کرتے تھے، ہر وقت کام کرنا چاہتے تھے اور ہر گھڑی کام کرتے رہتے تھے۔ متمدن اور مہذب شہر کا کوئی ترقی پسند باشندہ بھولے سے بھی یہاں آجاتا۔ تو اس گہوارۂ جہالت

کے غیر مہذب اور غیر متمدن لوگوں پر نفریں بھیجتا ہوا فوراً واپس چلا جاتا۔ اور خداداد بستی کے باشندے جب کسی شہر میں سے گزرتے تو اپنے آپ کو ایک اجنبی ماحول میں گھرا ہوا پاتے تھے اور چاہتے کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنے دیس میں پہنچ جائیں۔

باوجودیکہ یہاں زندگی کی کوئی راحت، کوئی آسائش میسّر نہیں تھی ــــ لیکن وہ ہشاش بشاش، خوش باش اور مسرور تھے۔ جس ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے اس ماحول سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ اس سے علیحدہ ہونا انھیں ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں تھا۔ اور جس محنت اور مشقت سے دونوں وقت اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ وہ محنت و مشقت ان کے لیے سرچشمۂ راحت بن گئی تھی۔

برسوں سے ان کی زندگی کی تیز و تند ندی اسی طرح بہے چلی جا رہی تھی۔ کہ نہ تو اس کی تہ میں کوئی کثافت پیدا ہوئی تھی اور نہ پانی کی روانی میں کوئی فرق آیا تھا۔

مشقت ــــ اور دن رات مشقّت ــــ محنت ــــ اور ہر وقت محنت۔ یہی ان کی زندگی کا اصول تھا اور وہ اس اصول پر سختی سے کاربند تھے۔ ان کے یہاں کافی گیہوں موجود رہتا تھا اور فاقے کی تو کبھی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ تاہم مٹّی سے لدے ہوئے گدھے روزانہ صبح کے وقت پگڈنڈیوں پر جاتے ہوئے نظر آتے اور صبح سے لے کر شام تک بستی کی فضا میں چرخے اور چکی کی آواز گونجتی رہتی۔

(۲)

یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ کہ مشہور لکھ پتی سوداگر سردار احمد جواد اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہوا اس ویران اور بنجر علاقے میں آنکلا۔ سردار صاحب اپنی سخاوت، فیاضی اور انسانیّت پرستی کی بنا پر ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لوگ ان کا نام سنتے ہی فرطِ ادب و احترام سے سر جھکا لیتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ سردار صاحب تھے بھی اسی قابل کہ ہر شخص ان کی دل و جان سے عزّت کرے۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا۔ کہ خدا نے کچھ انسانوں کو اس غرض سے دولت مند بنایا ہے کہ وہ دنیا کے بیکس اور غریب انسانوں کی کسی طرح مدد کرتے رہیں۔ دولت کا سب سے بڑا

مصرف یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کے کام آئے۔

سردار صاحب غریبوں کو آرام پہنچا کر بے حد مسرور ہوتے تھے اور آج خداداد بستی کی تیز و تند اور شفاف ندی کے کنارے کھڑے ہو کر سردار صاحب اس بنجر علاقے کے بدنصیب مفلوک الحال انسانوں کی حالتِ زار پر غور کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے یہ لوگ کس قدر بدقسمت ہیں نہ انھیں زندگی کی کوئی آسائش میسّر ہے اور نہ جیون کا کوئی سُکھ۔ یہ گدھوں پر بوجھ لادنے والے لوگ گدھوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رات دن محنت کرتے ہیں۔ تب کہیں روکھی سوکھی کھا کر پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔

اب سردار صاحب کسی اور خیال میں غرق ہو گئے —— چند لمحوں کے بعد ذہن میں ایک خیال کے آتے ہی ان کا چہرہ مسرت سے سرخ ہو گیا۔ انھوں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور پاس پڑے ہوئے مٹی کے ڈھیر کو پاؤں مارا۔ مٹی پانی میں گر پڑی۔ شفاف ندی کی سطح گدلی ہو گئی —— !

سردار صاحب نے کچھ دیر پانی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے دوستوں کی طرف جانے لگے۔

(۳)

سردار صاحب نے جو کچھ سوچا تھا۔ وہ کر دکھایا۔ خداداد بستی کے ایک گوشے میں ایک بڑا سا لنگر خانہ قائم کیا گیا جس کے ساتھ ایک گودام تھا اور وہیں گودام میں گندم اور ہر قسم کے اناج کی اچھی خاصی مقدار موجود تھی۔ بڑے بڑے تنور لگوا دیئے گئے تھے —— یہ سب کچھ ہوا تھا مگر جن لوگوں کے لیے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ وہ اس کارروائی کو بڑی حیرت اور تاسف سے دیکھ رہے تھے۔ حیرت اس لیے کہ ان کو بالکل خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور تاسف اس وجہ سے کہ وہ سمجھتے تھے کہ سردار صاحب ان کی بستی پر قبضہ کر لیں گے۔ اور وہ بسر اوقات کے پہلے اور آخری ذریعے سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

سردار صاحب کے مُلازموں نے انھیں سمجھایا کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے انھی کے لیے کیا جا رہا ہے گندم اور اناج کی بوریاں اس غرض سے رکھی گئی ہیں۔ کہ ان کے لیے اچھی سے اچھی خوراک مہیا

کی جائے اور تنور اسی لیے لگوائے گئے ہیں کہ ان کے لیے روٹیاں تیار کی جائیں۔ بستی کے لوگ سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ پھر بھی کچھ نہیں سمجھے تھے۔ وہ سوچتے تھے۔ آخر سردار صاحب کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ہمارے لیے اتنا روپیہ ضائع کردیں۔ شہر میں جاتے ہیں تو اتنی محنت اور مشقت سے نکالی ہوئی مٹی کے لیے ایک دھیلہ دینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ شہر کا ایک دولت مند آدمی ہم سے کوئی کام لیے بغیر ہمارے کھانے پینے کا انتظام کردے —— یہ کبھی نہیں ہو سکتا —— سردار ضرور کوئی چال چل رہا ہے۔ جسے ہم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور ہر دن گزرنے کے بعد بستی کے لوگ اپنی زندگی کی پگڈنڈی سے ایک قدم پیچھے ہٹ جاتے تھے —— کچھ دنوں کے بعد جب ان لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ سردار صاحب نے ان پر رحم کرکے انھیں محنت اور مشقت سے نجات دلادی ہے۔ تو وہ سوچنے لگے سردار صاحب کو کس نام سے یاد کریں۔ سردار صاحب کے نوکر نے انھیں بتایا۔ کہ سردار صاحب اُن کے لیے اَن داتا ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ انھیں اَن داتا کہنے لگے۔

اتنا آرام، اتنی آسائش —— یہ لوگ چاہتے تھے کہ اپنا تن من دھن سب کچھ اپنے اَن داتا پر قربان کردیں۔ انھیں زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ زندگی میں اتنی بڑی راحت، اتنا بڑا آرام بھی ہے۔ وہ دونوں وقت لنگر خانے پر جاکر پیٹ بھر کر کھا لیتے۔ سردار صاحب کے دیئے کپڑے پہن لیتے اور سارا دن یا تو تاش کھیلتے رہتے یا اس قسم کی دوسری تفریحات میں ڈوبے رہتے۔

سردار صاحب جب ان لوگوں کو خوش و خرم دیکھتے تو ان کا دل باغ باغ ہوجاتا اور انھیں یوں محسوس ہوتا کہ انھوں نے وہ فرض جو انسانیت کی طرف سے ان پر عائد تھا۔ ادا کردیا ہے۔ —— جب یہ لوگ انھیں اَن داتا کہہ کر ان کے سامنے قریباً قریباً سربسجدہ ہوجاتے تو ان کا دل ایک خاص غرور سے لبریز ہوجاتا —— اور گھنٹوں ان کے دماغ اور دل پر ایک مستی سی، ایک کیف سا چھایا رہتا۔

عذرا —— سردار صاحب کی اکلوتی بیٹی بھی باپ کی طرح رحمدل تھی۔ غریبوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اور وہ بھی لوگوں کی غربت سے متاثر ہوکر پہروں

کڑھتی رہتی تھی۔ باپ کی انسانیت پرور سرگرمیوں سے اسے خاص دلچسپی تھی، چنانچہ وہ بھی کبھی کبھی خداداد بستی میں آکر باپ کے ساتھ ان لوگوں سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ یہ لوگ اس کی بے حد عزت کرتے تھے اور وہ محسوس کرتی تھی کہ اس کی ہستی ان سے بہت بلند ہے۔ اتنی بلند جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور سردار صاحب اور ان کی بیٹی کی نیک نامی ہر جگہ پھیلتی جا رہی تھی۔

اب سردار صاحب نے بستی میں اپنے لیے ایک شاندار مکان بنا لیا اور اس میں رہائش اختیار کرلی۔ ان کی صاحبزادی بھی چند دن سے وہاں تھی۔ ایک رات سردار صاحب کی اچانک آنکھ کھل گئی، اور وہ دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ عذرا پلنگ پر موجود نہیں ہے۔ وہ گھبرا کر اُٹھے۔ دوسرے کمرے میں گئے۔ عذرا وہاں بھی موجود نہیں تھی۔ سردار صاحب کو اپنی بیٹی پر بہت غصہ آیا کہ رات کے وقت بھی "مہراں" کے بیمار بچے کی خبر گیری کے لیے چلی گئی ہے۔ انھوں نے اسے کئی بار منع کیا تھا، کہ اتنی تکلیف کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ مگر لڑکی کی رحم دلی اُسے پل بھر بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔

وہ نیچے اترے اور "مہراں" کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ ابھی چند ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ سامنے جو منظر دیکھا۔ اس سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مہراں کا شوہر ان کی بیٹی کے گلے میں بازو حائل کرکے نہ معلوم اسے کیا کہہ رہا تھا۔

غم و غصہ سے سردار صاحب کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

ان کی غضب ناک آواز فضا میں گونجنے لگی۔

مہراں کا شوہر ان کی بیٹی سے الگ ہوکر تاریکی میں غائب ہوگیا۔

دوسرے دن سردار صاحب کے ملازم لنگر خانے کی ہر ایک چیز گاڑیوں میں لاد کر لئے جا رہے تھے۔

(۴)

کئی سال بعد ـــــ

سردار صاحب اپنے چند نوکروں کے ساتھ شام کے وقت موٹر میں بیٹھے ہوئے چلے جا رہے تھے ——— موٹر اُڑی جا رہی تھی۔ یکایک کوئی بھاری بھرکم چیز موٹر سے ٹکرائی۔ موٹر رک گئی اور اس سے پیشتر کہ سردار صاحب حالات کا جائزہ لیں۔ وہ کئی آدمیوں کے نرغے میں گرفتار تھے۔ تمام کارروائی چند منٹ میں ہو گئی۔ سردار صاحب کی جیبوں میں جتنی نقدی تھی حملہ کرنے والوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ڈاکو دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو گئے۔

اب سردار صاحب ایک کیچڑ بھری ندی کے کنارے کھڑے تھے۔

"مالک! میں پہلے ہی کہتا تھا کہ ادھر سے مت گزریئے۔ یہ خداداد بستی کے لوگ بڑے ڈاکو ہیں۔"

"یہ خداداد بستی کے لوگ تھے؟"

سردار صاحب کے منہ سے نکلا اور انھوں نے غصّے سے پاس پڑے ہوئے مٹی کے تودے کو زور سے پاؤں مارا۔ مٹی ندی میں گر پڑی۔ کیچڑ کی چھینٹیں اڑ کر سردار صاحب پر جا پڑیں۔

کئی منٹ تک سردار صاحب مبہوت کھڑے رہے۔

ایک دُکان

صبح ہو یا شام، دوپہر ہو یا رات کا پہلا پہر، میں جب بھی بازار سے گزرتے وقت اِس دکان کے قریب پہنچتا ہوں تو میری نگاہیں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں، اور میں ایک آدھ لمحہ توقف کیے بغیر آگے قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کے بارے میں بہت سے واقعات جانتا ہوں۔ یہ واقعات میری آنکھوں کے سامنے رونما ہو چکے ہیں اور ابھی تک اپنی تمام جزئیات کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

اس دکان کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ انسانی تاریخ کی طرح دلچسپ نہ سہی۔ مگر چند انسانوں کو اس سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی تاریخ میں سب سے نمایاں چیز کیا ہے۔ مسلسل جدوجہد۔ کامیابی اور ناکامی اور اس دکان کی تاریخ بھی انسانوں کے ایک نہایت مختصر گروہ کی تگ و دو، کشمکش اور کامیابی اور ناکامی کی آئینہ دار ہے۔ اور میں اس سے کافی متاثر ہوں۔ شاید آپ بھی اس میں کچھ دلچسپی محسوس کر سکیں۔

شروع شروع میں جب یہ مکان تعمیر ہوا اور اس کے نچلے حصے کے ایک کمرے کو دکان بنایا گیا تو اس وقت یہاں کون تھا اور کیا کرتا تھا ـــــــ میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اس زمانے میں میں یہاں موجود ہی نہیں تھا، اور مجھے اس دکان کے دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اصل میں اس دکان کی تاریخ اس وقت شروع ہوتی ہے جب میں اپنے خاندان کے ساتھ اس کے قریب آ کر رہنے لگا۔ اور یکے بعد دیگرے ان واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگا جنھیں معرضِ تحریر میں لانے کا کام اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔

جب میں یہاں آیا تو اس دکان میں اللہ بخش پھل لگاکر بیٹھا کرتا تھا۔ اللہ بخش ادھیڑ عُمر کا شخص تھا۔ بہت شریف اور نیک انسان بچوں کے ساتھ تو اس کا سلوک خاص طور پر قابلِ تعریف تھا۔ بازار کے قریب قریب تمام بچے اسی دکان سے پھل خرید کر لے جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ وہ دوسری دکانوں کی بہ نسبت انھیں پھل کچھ زیادہ ہی دیتا تھا اور ان کے ساتھ کچھ دیر تک باتیں بھی کر لیتا تھا۔ مثلاً ابّا جان کہاں ہیں، اب تم گھر جاکر کیا کروگے۔ سکول میں تمہیں پٹیا تو نہیں جاتا اور امتحان کی تیاری کر رہے ہونا" ——— اور اس قسم کی اور باتیں ——— بچے یہ باتیں بڑے شوق سے سُنتے اور ہر بات کا پورا پورا جواب دیتے۔ اللہ بخش ان سے خیریت ہی دریافت نہیں کرتا تھا بلکہ نصیحت بھی کرتا رہتا تھا۔" دیکھو بھئی دل لگاکر کام کرو۔ جو لڑکے دل لگا کر کام کرتے ہیں وہ بڑے ہوکر کپتان بن جاتے ہیں۔ اور جو محنت نہیں کرتے وہ بازاروں میں چھابڑی لگا کر بیٹھ جاتے ہیں" ! بچے یہ باتیں ہر روز سنتے رہتے تھے۔ ان کا اور کچھ اثر ہو نہ ہو مگر یہ بات ضرور تھی کہ اللہ بخش بچّوں میں بہت مقبول ہو گیا تھا۔

اللہ بخش کے ہاں تین بچے ہوئے تھے۔ دو مر گئے تھے اور ایک بھاٹی دروازے کے باہر اسلامیہ ہائی سکول میں پانچویں کا طالب علم تھا۔ اس کا نام عزیز دین تھا۔ بڑا محنتی اور ذہین لڑکا تھا اور ہمیشہ جماعت میں اوّل رہتا تھا۔ اللہ بخش کی بڑی آرزو تھی کہ اس کا بچہ بڑا ہو کر کپتان بنے۔ اور عزیز دین بھی یہ جانے بغیر کہ کپتان کیا ہوتا ہے اپنے دل کی گہرائیوں میں کپتانی کی آرزو پرورش کر رہا تھا۔ اللہ بخش کی بیوی بھی اس آرزو میں اپنے شوہر کے ساتھ برابر کی شریک تھی۔ اس نے اپنے والدین کے گھر بڑی مصیبت کے دن گزارے تھے۔ اس کا باپ قلعی گر تھا جو روزانہ روپیہ ڈیڑھ روپیہ سے زیادہ نہیں کما سکتا تھا ——— سات افراد کے خاندان میں روپیہ ڈیڑھ روپیہ کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ اور جب وہ والدین کے گھر سے رخصت ہو کر اللہ بخش کے گھر میں آئی تو یہاں بھی عسرت کا وہی عالم تھا۔ اللہ بخش کی آمدنی معقول تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کے کندھوں پر باپ کے چھوڑے ہوئے قرض کا بارِ گراں بھی آپڑا تھا۔ اور اس آمدنی کا اکثر و بیشتر حصہ قرض خواہوں کی جیبوں میں چلا

جاتا تھا۔ عزیز دین کی ماں بڑے صبر اور استقلال کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کی تاریک دنیا میں اس کا اکلوتا بیٹا امید کی کرن بن کر چمک رہا تھا۔ وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی کہ عزیز دین پڑھائی سے فارغ ہو کر کپتان بن گیا ہے۔ اس کی وردی بڑی خوبصورت ہے ——— وردی کے بٹن چمک رہے ہیں ——— اس کے سینے پر ایک بڑا خوبصورت تمغہ آویزاں ہے ——— اور ایک بڑے عالیشان مکان کے دروازے پر اس کی موٹر کھڑی ہے۔ اور وہ موٹر سے اُتر کر اس کی طرف آرہا ہے۔

اللہ بخش کی بیوی کا چچا دہلی میں رہتا تھا۔ جو مہینے میں دو ایک بار خط ضرور بھیجا کرتا تھا۔ یہ خط پڑھوانے کے لیے اللہ بخش کی بیوی مجھی کو بلایا کرتی تھی اور باتوں باتوں میں ضرور پوچھتی تھی کہ کپتان کی تنخواہ کتنی ہوتی ہے اور وہ کتنا بڑا آدمی ہوتا ہے ——— میں اس کی باتوں کا جواب دیتا تو وہ خط ہاتھ میں تھامے دیر تک اپنے سنہری سپنوں کی فضا میں کھوئی رہتی!

"میں پوچھتا" خالہ! تم عزیز کو کپتان بنا کر ہی چھوڑو گی!"

اس پر وہ ہنس پڑتی ——— "باؤ کہتا تھا اَجو بڑا لیک اور ہشیار ہے جرور کپتان بنے گا!"

اللہ بخش کی بیوی اپنے شوہر کو باؤ کہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ شادی سے پہلے بابو کے خواب دیکھا کرتی تھی ——— مگر بابو کے بجائے اس کو ایک پھل بیچنے والا ملا۔ اور اب وہ اسی کو باؤ سمجھ کر نفسیاتی طور پر اپنے مایوس دل کے لیے ایک مبہم امید کا سہارا پیدا کر رہی تھی۔

اللہ بخش کو اس دکان سے خاص محبت تھی۔ گرمی ہو یا سردی۔ ہر روز صبح سویرے پھلوں کے ٹوکروں کو ایک لمبی سی چادر سے ڈھانک کر، جھاڑو سے دکان کے ہر ایک کونے کھدرے کو پوری طرح صاف کرنا اس کا معمول تھا اور اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوا تھا۔ اللہ بخش نے کئی مرتبہ اپنی جیب سے خرچ کر کے اس کی مرمت بھی کروائی تھی۔ کیونکہ دکان کے مالک کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے دلچسپی صرف کرائے سے تھی۔ اور یہ چیز

انتہائی باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ اس کے پاس پہنچ جاتی تھی

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس نے کبھی کسی بچے سے تلخ لہجے میں بات کی ہو۔ مگر اس بچے کو وہ ضرور جھڑک دیتا جو کوئلے سے اس کی دوکان کے دروازے یا دیوار کو بدنما کر دیتا۔ اللہ بخش کو اس دکان سے اتنی شدید محبت اس لیے تھی کہ یہ دکان اس کے خاندان کو روٹی دے رہی تھی ——— اس کی بنیادی ضرورتیں پوری کر رہی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے اجو کو تعلیم دلا کر ایک ایسی منزل کی طرف لے جا رہی تھی جہاں پہنچ کر اُسے کپتان بننا تھا!

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں کوئی چیز لینے کے لیے دکان پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اللہ بخش خلافِ معمول مایوسی کی حالت میں سر جھکائے بیٹھا ہے۔ میں نے کبھی اللہ بخش کو ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے پوچھا۔

"کیا ہوا اللہ بخش؟"

"کچھ نہیں باؤجی!"

"پھر بھی ——— تم اُداس نظر آرہے ہو"

اللہ بخش نے آہ بھری اور جھلنی سے کھجوروں پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں ہٹا کر بولا۔

"حاجی صاحب (دکان کے مالک) دُگنا کرایہ مانگتے ہیں۔ میں تو یہ کرایہ بھی اللہ جانتا ہے بڑی مشکل سے ادا کرتا ہوں"

"کوئی فکر نہ کرو اللہ بخش میں حاجی صاحب کو سمجھا دوں گا۔ پندرہ روپے معمولی کرایہ نہیں ہے!"

"تم کیا سمجھاؤ گے بابو ——— تیس روپے دینے والا بھی موجود ہے!" اللہ بخش لمبی آہ بھر کر کہا۔

پھر بھی میں کوشش کروں گا۔ تم گیارہ بارہ سال سے یہاں ہو، پھر تم نے کبھی کرایہ ادا کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی ——— ایسے شریف آدمی کا حاجی صاحب کو کچھ تو لحاظ کرنا چاہیئے۔

"اچھا ـــــ جی۔"

دو چار لوگ اور بھی وہاں آگئے ـــــ اور انھوں نے بیک زبان اللہ بخش کو یقین دلایا کہ اگر حاجی نے تمہیں نکال دیا تو تمہاری جگہ جو شخص بھی آئے گا، بازار کے سب لوگ اس کا بائیکاٹ کردیں گے۔ یہ الفاظ سُن کر اللہ بخش کی بجھی بجھی آنکھوں میں اُمید کی روشنی جھلملانے لگی۔ وہ بہت حد تک مطمئن ہوگیا اور اسی دن بازار والوں کے اس خطرناک ارادے کی خبر حاجی صاحب تک پہنچ گئی۔

پندرہ بیس دن گزر گئے اور اس دکان میں اللہ بخش ہی بیٹھا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ ہماری تنبیہہ کامیاب ثابت ہوئی ہے اور حاجی صاحب اپنے ارادے سے باز آگئے ہیں۔ اور اب وہ اللہ بخش کو دکان سے الگ نہیں کریں گے۔ مگر ایک دن میں نے دیکھا کہ دکان بند ہے۔ تیسرے دن جب دکان کُھلی تو اس کے اندر پھلوں کے ٹوکروں کے بجائے کپڑا سینے کی مشین پڑی تھی، اور اللہ بخش کی بجائے ایک درزی بیٹھا تھا ـــــ مجھے اس کی توقع نہیں تھی، مجھے کیا بازار میں کسی کو بھی اس کا خیال نہیں تھا کہ حاجی صاحب بازار والوں کے عدمِ تعاون کے ارادے کی خبر سُن کر بھی اللہ بخش کو دکان سے نکال دیں گے۔ مگر انھوں نے اپنی من مانی کرکے دم لیا تھا۔ اب یہ کام بازار والوں کا تھا کہ وہ اپنے ارادے کو عملی صورت دیں۔ چنانچہ کئی دن تک لوگ دکان کے قریب تک بھی نہ آئے ـــــ عدمِ تعاون کی تحریک پورے زوروں پہ تھی، رمضان درزی گھبرا گیا۔ حاجی صاحب نے لوگوں کو سمجھایا کہ اگر تم اس سے کام نہیں کراؤ گے تو یہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کیونکر بھر سکے گا ـــــ یہ بات بہت کارگر ثابت ہوئی۔ آہستہ آہستہ عدمِ تعاون کی تحریک ختم ہوگئی۔ اسی اثنا میں اللہ بخش بھی اپنا مکان چھوڑ کر لوہاری منڈی چلا گیا، اور میں کئی ماہ تک اسے نہ دیکھ سکا۔ ایک مرتبہ میں تحصیل بازار میں پرائمری سکول کے سامنے سے گزر رہا تھا تو میں نے اللہ بخش کو چھابڑی لگائے ہوئے دیکھا۔

"اب کس طرح گزر رہی ہے؟" میں نے پوچھا

"اللہ کا شکر ہے جو دم نکلے واہ وا!" ایک لمحہ خاموش رہ کر بولا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا

"اور وہ کہاں ہے؟"

"کون ـــــ کپتان ـــــ وہ ہے"

میں نے وائیں طرف دیکھا۔ عزیزہ دین میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس شکر قندی بیچ رہا تھا۔

"اب اس کا نام کپتان رکھ دیا تم نے!"

یکلخت اللہ بخش کے چہرے کا رنگ راکھ میں اٹے ہوئے کوئلے کی طرح سیاہ پڑ گیا۔" باؤجی بیچارہ پڑھ نہیں سکا۔ پھیس (فیس) کے لیے پیسے کہاں سے لاتا ـــــ ـــــ آپ حاجی صاحب سے کہہ کر دکان لے دیجیئے۔ لے دیں گے نا باؤجی!"

چند دن کے بعد میں اللہ بخش کو کہیں بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا!

اللہ بخش کے بعد اس دکان میں رمضان درزی آبیٹھا۔ رمضان درزی اس بازار میں نہیں رہتا تھا، بلکہ موچی دروازے کے اندر کھجور والی گلی میں رہتا تھا اور اس کی چھوٹی سی دکان موچی دروازے کے باہر مہتاب پان فروش کی دکان کے ساتھ ملحق تھی اور دونوں میں دکان کی حد بندی کے معاملے پر اکثر تو تو میں میں ہوتی رہتی تھی۔ اس لیے رمضان مدت سے کسی اچھی دکان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ ایک دن اس کی ملاقات حاجی صاحب سے ہوگئی اور اس نے دکان کے لیے تیس روپے ماہانہ کرایہ ادا کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ بخش کو مجبوراً دکان سے نکلنا پڑا۔ اور اس کی بجائے یہاں رمضان آگیا ـــــ یہاں سارے بازار میں اس کے علاوہ صرف ایک درزی کی دکان بھی تھی اور چونکہ رمضان کام محنت اور صفائی سے کرتا تھا اس لیے دوسرے درزی کے مقابلے میں اسے زیادہ کام ملنے لگا اور اسی نسبت سے اس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوگیا۔

رمضان اپنی بڑھتی ہوئی آمدنی کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ اور بڑی تیزی سے اپنی بڑی لڑکی کے لیے جہیز کا سامان تیار کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں اس قرض کا بقیہ حصہ بھی ادا کر دیا جو اسے باپ کی موت پر بطور ورثے کے ملا تھا۔ اس نے خود خرچ کر کے دکان

کی سفیدی کرائی، دروازے پر رنگ کرایا اور آرائش کے لیے دکان کی پیشانی پر بجلی کے دو بلب بھی لٹکا دیئے، جو شام کے وقت دور دور تک روشنی پھیلا دیتے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب رمضان کے اس دکان میں قدم جم چکے ہیں اور وہ کبھی اس سے علیحدہ نہیں ہو گا۔ اور نہ حاجی صاحب کو کبھی ضرورت پیش آئے گی کہ وہ اسے دکان سے علیحدہ ہونے کے لیے کہیں۔

ایک دن ـــــ اور وہ جمعہ کا دن تھا ـــــ میں رمضان کو قمیص کے لیے کپڑا دے رہا تھا کہ حاجی صاحب نے بلند آواز میں "سلاماں علیکم" کہا اور فوراً کپڑے سے کرسی صاف کر کے دکان کے چبوترے پر لگا دی۔

حاجی صاحب بیٹھ گئے اور اپنی نورانی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے "رمضان! جمعہ کی نماز نہیں پڑھی تم نے؟"

رمضان کی آنکھیں اظہارِ شرمندگی میں بے اختیار جھک گئیں۔ "نہیں حاجی جی ـــــ وہ ـــــ میرے کپڑے خراب تھے۔ رات بلّو نے گود میں پیشاب کر دیا تھا۔"

"بہت بری بات" حاجی صاحب نے نفرت اور افسوس کے ملے جلے لہجے میں کہا "دھو کر صاف کر سکتے تھے کپڑے ـــــ دیکھو بھائی نماز پڑھا کرو۔ اللہ رزق میں برکت دیتا ہے ـــــ" یہ کہہ کر حاجی صاحب نے ایک لمبی آہ بھری "اخو کتنے ناشکرے ہیں ہم اپنے روزی دینے والے کو بھول جاتے ہیں۔"

"بس اب نماز پڑھا کروں گا حاجی جی!" رمضان نے وعدہ کر لیا۔

"ضرور پڑھا کرو ـــــ اللہ اپنے بندے کو کبھی نہیں بھولتا۔ میرے مولا کی جناب میں کوئی کمی نہیں ـــــ دینے والے کے رنگ نیارے ہیں۔"

اور رمضان درزی دینے والے کے نیارے رنگ پر غور کرنے لگا۔ اس کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی بڑی لڑکی کے بیاہنے کے لیے جہیز کا سامان ہو رہا تھا۔ تمام کا تمام قرض اُتر چکا تھا ـــــ دینے والے کے رنگ نیارے نہیں تو اور کیا تھا؟

رمضان اور غور کرتا پر حاجی صاحب زور سے چھینکے اور کندھے پر پڑے ہوئے زرد

رنگ کے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے بولے ـــــ

"ایک عجیب معاملہ درپیش ہے رمضان!"

"کیا حاجی جی؟" رمضان کا چہرہ یک لخت سنجیدہ ہوگیا۔ اس کے لہجے میں فکرمندی کا احساس نمایاں تھا۔

"تم جانتے ہو ہماری عادت کو۔ کسی سے وعدہ کرلیں تو اسے پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس میں، ہمیں خواہ نقصان ہی اٹھانا پڑے ـــــ تو معاملہ یہ ہے بھائی کہ بازار والے تمہارے یہاں آنے کی مخالفت کرتے تھے کہ ایک غیر محلّے کا آدمی ہمارے محلّے میں کیوں آئے، لیکن میں نے پروا نہ کی۔ بھائی تم سے وعدہ کرچکا تھا ـــــ"

"پر محلے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں دگنا کرایہ دے رہا ہوں۔" رمضان تڑپ کر بولا۔

"بھائی کرائے ورائے کی بات چھوڑو ـــــ یہ دیکھو وہ کہتے تو ٹھیک ہیں نا۔" حاجی صاحب نے دوبارہ رومال سے منہ پونچھا۔

"حاجی جی کون کہتا ہے؟" رمضان کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔

"کون کہتا ہے! بھائی کون نہیں کہتا۔ کریم کو جانتے ہو نا۔ وہی کریم ـــــ"

"گنجا پاپی ـــــ" رمضان جلدی سے بولا۔ اور اس کے چہرے سے تمام سنجیدگی دور ہوگئی۔

"استغفراللہ ـــــ میاں اللہ سے ڈرو۔ اگر وہ تمہیں لنگڑا کردے تو؟"

"کہتا کیا ہے حاجی جی؟"

"وہ چھ ماہ سے اس دکان کے پیچھے پڑا ہے ـــــ چند دن سے بازار کے چھ چھ سات سات آدمی ساتھ لے کر میرے پاس آرہا ہے۔ حیران ہوں، کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ اللہ تمہیں ہدایت دے تم خود ہی اس سے فیصلہ کرلو۔" حاجی صاحب بولے

"میں فیصلہ کیا کروں گا، حاجی جی ـــــ دکان آپ کی ہے۔ آپ جسے چاہیں دیں کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟" رمضان نے دلیل پیش کی۔

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے، پھر بھی ڈرتا ہوں کہیں فساد نہ ہوجائے۔ باتوں ہی باتوں میں

معاملہ طول پکڑلیتا ہے اور مجھے یہ چیز ہرگز پسند نہیں کہ میری دکان کی وجہ سے دو شریف آدمیوں میں لڑائی ہو۔ تم اسے سمجھا دو بھائی جتنا کرایہ تم دینے پر تیار ہو اتنا میں بھی دے دوں گا۔"

حاجی جی ہم مر نہیں گئے، کتنا کرایہ دینا چاہتا ہے؟

"اوخو تم بات سمجھتے ہی نہیں ——— ہمیں ڈر صرف اس بات کا ہے کہ معاملہ بڑھ نہ جائے ——— وہ تو بھائی میرے چھ ماہ کا پیشگی ادا کرنے پر تیار ہے۔"

"میں بھی دے دیتا ——— پر آپ جانتے ہیں بڑی بیٹی ———"

"ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں ——— وہ آئے گا کسی دن فیصلہ کر لینا۔ ٹھیک ہے نا۔ میرا مولا صلح صفائی کی باتوں کو پسند کرتا ہے ——— قربان اس سچی سرکار کے ———"

حاجی صاحب رمضان کی بات کاٹ کر بولے

اور حاجی صاحب تشریف لے گئے۔

حاجی صاحب جس فساد کی طرف اشارہ کر کے گئے تھے وہ دوسرے دن ہی ہو گیا۔ ہوا یہ کہ کریم رمضان کی دکان پر آیا۔ باتوں باتوں میں تلخی پیدا ہو گئی اور معاملہ ہاتھا پائی تک جا پہنچا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ اور اس کے دوسرے روز حاجی صاحب نے رمضان کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ کہ چونکہ معاملہ بڑھ گیا ہے۔ اس لیے تمہارا دکان میں رہنا ٹھیک نہیں ——— اور رمضان کو مجبوراً دکان چھوڑنا پڑی ———

رمضان درزی کے جانے کے بعد دکان ایک ہفتہ تک بند رہی۔ ایک ہفتے کے بعد کھلی تو میں نے دیکھا کہ اس کے اندر کپڑے کا کاروبار کرنے والے لالہ دین دیال بیٹھے ہیں اور ان کے ارد گرد کپڑے کے بیسیوں تھان پڑے ہیں۔ رمضان کے بعد اصولاً یہاں کریم کو آنا چاہیئے تھا۔ مگر آ گئے لالہ جی۔ یہ معمّا کیا ہے؟ میں نے سوچا اور دوسرے دن ہی اصل حقیقت ظاہر ہو گئی۔ حاجی صاحب نے کریم سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر تو مجھے چھ ماہ کا پیشگی کرایہ ادا کر دے تو میں تجھے دکان خالی کرا دوں گا ——— کریم نے پیشگی کرایہ ادا کر دینے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اور جب رمضان مجبور ہو کر دکان خالی کرنے لگا تو لالہ جی نہ جانے کس طرح میدان میں آ کودے۔ اور انھوں نے حاجی صاحب پر نہ جانے کیا اثر ڈالا کہ دکان ان کو مل گئی۔ شاید انھوں نے سال

بھر کا پیشگی کرایہ دے دیا ہوگا۔ یا کرائے میں معقول اضافہ کر دیا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔ جس نے حاجی صاحب کو متاثر کر دیا تھا۔

جب میں نے لالہ جی کو دکان پر دیکھا تو دل میں سمجھ لیا کہ اب یہ دکان آخری دم تک لالہ جی کے پاس رہے گی، اور جب لالہ جی دُنیا سے رخصت ہو جائیں گے، تو ان کا بیٹا یہاں آ بیٹھے گا، اور بیٹے کے بعد اس کا بیٹا، اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

دو سال تک تو میرا یہ یقین غیر متزلزل رہا اور حاجی صاحب کو ان کے خلاف کسی قسم کی شکایت پیدا نہ ہوئی، اور شکایت پیدا ہو بھی کیونکر سکتی تھی۔ انھیں گھر بیٹھے معقول کرایہ مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کپڑے کے معاملے میں بھی انھیں کافی مراعات حاصل تھیں۔ جس قسم کا کپڑا چاہتے تھے لالہ جی سے بارعایت خرید کرلے جاتے تھے اور کیا چاہیئے تھا انھیں؟

ہمارے بازار میں رہنے والوں کی اکثریت مسلمان تھی۔ ہندو اور سکھوں کے چند گھر تھے۔ یہ لوگ اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ کاروبار کرتے تھے۔ دفتروں میں جاتے تھے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ عام اجتماعی تقریبات میں بھی برابر حصہ لیتے تھے۔ شہر کے دوسرے حصوں کے بارے میں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بازار میں کبھی ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا تھا! —— اسی ماحول میں میں نے ایک دن سُنا کہ ہماری مسجد کے امام صاحب کو حاجی صاحب سے اس بارے میں سخت شکایت ہے کہ انھوں نے اپنے کسی مسلمان بھائی کی بجائے دکان ایک ہندو کو دے دی ہے۔

یہ اعتراض ہمارے بازار میں اپنی نوعیت کا پہلا اعتراض تھا۔ اور اجتماعی زندگی کے متعلق ایک نئے زاویۂ نگاہ کو منظرِ عام پر لا رہا تھا۔ پہلے پہل تو لوگوں نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ —— اور دی بھی تو اسے کوئی خاص اہم معاملہ نہ سمجھا۔ مگر ایک دن جب امام صاحب نے نماز کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ تک قرآن و حدیث کی روشنی میں غیر مسلموں کی ذہنی خباثت پر تقریر کی تو لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بازار کی صاف، شفاف، اور پرسکون زندگی کی نتھری ہوئی جھیل میں یکلخت ایک بڑا بھاری پتھر آگرا ہے۔ اور چاروں طرف ایک ہلچل سی مچ گئی ہے —— بازار کے رہنے والے دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔

ایک پارٹی لالہ جی کی حمایت پر تھی اور انھیں دکان سے الگ کرنا غیر منصفانہ فعل سمجھتی تھی۔ اور دوسری پارٹی وہ تھی جو امام صاحب سے شدید عقیدت رکھتی تھی اور ان کی ہر بات کو صحیح سمجھنا مذہب کا حقیقی تقاضا سمجھتی تھی۔ یہی پارٹی لالہ جی کے خلاف تھی۔ ایک دو مرتبہ دونوں پارٹیوں کے چند آدمیوں کے درمیان ہلکی سی چپقلش بھی ہوئی اور معاملہ بڑھ جاتا کہ لالہ جی مصلحتاً خود ہی دکان سے الگ ہو گئے۔

لالہ جی کے الگ ہو جانے کے بعد غیر مسلم پہلے کی طرح مسلمانوں کے بڑے اچھے ہمسائے تھے اور ان کی تقریبات میں ایک حد تک حصہ بھی لیتے تھے، اور مسلمانوں نے بھی ان کے ساتھ دیرینہ تعلقات منقطع نہیں کئے تھے۔ مگر ایک کشیدگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک اور زہر سا سرایت کرنے لگا تھا، ان کی معاشرتی زندگی میں

لالہ جی بوریا بستر سمیٹ کر چلے گئے تو چوہدری طفیل کا بھانجہ محمد نذیر اس دکان کو سجانے لگا۔ چوہدری طفیل بازار کیا شہر کے مخیّر لوگوں میں سے، ہر جمعرات کو فقیروں کو روٹی کھلاتے تھے ——— اور مسجد اور امام مسجد کے معاملے میں تو خاص دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جیب سے روپیہ خرچ کر کے امام صاحب کے لیے مسجد کے اندر ایک خوبصورت حجرہ بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے گھر سے روزانہ امام صاحب کے لیے روٹی بھی جاتی تھی ——— نذیر احمد انھی چوہدری صاحب کے بھانجے تھے۔ اپنے والدین کے ساتھ جنوبی افریقہ سے آئے تھے ——— پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے اس لیے تجارت کرنا چاہتے تھے ——— ان کی بڑی خواہش تھی کہ بازار میں کوئی دکان کھول کر کام شروع کردیں۔ مگر محلّے میں کوئی دکان خالی نہیں تھی۔ ——— اور آخر انھیں دکان مل ہی گئی۔

تو یہ ہے اس دکان کی تاریخ ——— چودہ سال کی مدت میں جتنے واقعات اس کے ساتھ پیش آئے وہ میں نے لکھ دیئے ہیں ——— نذیر احمد کو یہاں بیٹھے ہوئے پونے چار سال کا عرصہ گزر چکا ہے ——— اس دوران میں کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

اور آج فروری کی پہلی تاریخ ہے۔ حاجی صاحب جنوری کا کرایہ وصول کرنے کے

لیے دکان پر تشریف لائے ہیں ——— نذیر احمد صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا بنڈل نکالا ہے۔

"ان لوگوں کو تنگ کرتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی" حاجی صاحب داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"آپ کو تنگ کرتے ہیں، کس مُردار میں اتنی جرأت ہے کہ آپ کو تنگ کرے۔ ہمیں بتائیے جناب حاجی جی، ہم مر گئے ہیں کیا؟" نذیر احمد کی رگِ عقیدت مندی پھڑک اٹھی ہے۔

——— وہ آج شیخ نیاز علی کہہ رہا تھا ——— میں ——— دکان کے لیے دس روپے زیادہ دینے کے لیے تیار ہوں ———"

"کیا ——— حاجی جی!؟" ٭

آزادی

ہر روز صبح کے وقت جیسے ہی بازار کی دکانیں کھلنے لگتیں، اور لوگوں کے آنے جانے سے چہل پہل شروع ہو جاتی، فضا میں بار بار ایک کمزور، افسردہ اور مضمحل آواز گونج اٹھتی "بابا اللہ کے نام پہ اندھی کو دے جا۔ اللہ کے نام پہ اندھی کو دے جا" —— یہ آواز فاخراں کی تھی۔ اندھی فاخراں کی، جو صبح سے شام تک مسلسل چیخ چیخ کر اندھے ہونے کا اعلان کرتی رہتی۔ مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ بازار میں سے گزرنے والی ہزاروں آنکھوں میں سے صرف چند آنکھیں ہی ایسی ہوتی تھیں جو اسے دیکھ سکتی تھیں، کیونکہ جب وہ تھک تھکا کر اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ کھینچ کر گھر کے اندر جاتی تھی تو اس کی جھولی میں کبھی تو سات آنے کے پیسے ہوتے تھے، کبھی آٹھ آنے کے اور کبھی ان پیسوں سے بھی کم۔ ہاں تہوار کے موقعے پر روپیہ سوا روپیہ ہو جاتا تھا۔ مگر ظاہر ہے پورے سال میں تہوار چار پانچ سے زیادہ نہیں ہوتے اور تین سو چھیاسٹھ دنوں میں سے صرف پانچ چھ مرتبہ اوسط آمدنی سے کچھ زیادہ کما لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

جس دن فاخراں کی آمدنی چودہ آنوں سے زیادہ ہوتی اس دن وہ خوشی خوشی چبوترے سے اُٹھ کر اندر جاتی کیونکہ کئی ہفتوں کے بعد یہی ایک ایسا دن ہوتا، جب اُسے اور گھر والوں کو گوشت سبزی ملتی، اور روٹی کے بعد کوئی میٹھی چیز بھی، ورنہ ہر روز تو روٹی کے ساتھ دال، خالی سبزی یا مولی ملتی، اور یہ چیزیں کھا کھا کر وہ بیزار سی ہو جاتی۔

فاخراں اپنے پیٹ کے ہاتھوں بھیک مانگنے پر مجبور تھی۔ صرف اپنے پیٹ کے لیے

ہی نہیں، دو اور پیٹ بھی اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے وابستہ تھے۔ ایک پیٹ تو اس کی بڑی بہن زینو کا تھا۔ زینو کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ اور اسے روٹی پکانے، سالن تیار کرنے اور کبھی کبھی میلے کچیلے کپڑے دھو ڈالنے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ وہ دن کا بیشتر حصہ چارپائی پر لیٹے لیٹے گزار دیتی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی، کیونکہ کئی بار ماں نے اسے ڈانٹ پلائی تھی کہ اگر تو باہر نکلی تو تیری ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ وہ ماں کے ڈر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ گھر میں کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی۔ یونہی چارپائی پر بے کار پڑی رہتی تھی۔ دوسرا پیٹ فاخراں کی ماں کا تھا۔ فاخراں کی ماں دائم المرض تھی۔ دمے کی پرانی اور مہلک بیماری اس کے جسم کا خون چوستی رہتی تھی، اور نحیف و نزار ہڈیوں کا پنجر بنی ہر وقت اپنی چارپائی کے نیچے بلغم کے انبار لگاتی رہتی۔ زینو کو دن میں کئی کئی بار جھاڑو دینی پڑتی اور ہر بار جب بوڑھی ماں کے سینے میں بادل گرجنے لگتے وہ چپ چاپ چارپائی سے اٹھ کر جھاڑو کا رخ کرتی اور جگہ صاف کرنے کے بعد چارپائی پر گر پڑتی۔

فاخراں کی عمر ساڑھے آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اور چونکہ قد لمبا تھا اس لیے کچھ زیادہ عمر ہی کی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے دادا نے کبھی بھیک نہیں مانگی تھی۔ اس کے باپ نے کبھی گداگری نہیں کی تھی۔ اس کی ماں نے کبھی دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے تھے۔ مگر وہ بھیک مانگنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ صبح شام اس کا اور اس کی ماں بہن کا پیٹ کھانے کو مانگتا تھا، اور کھانا صرف پھیلے ہوئے ہاتھ ہی لا سکتے تھے۔ روٹی صرف مانگ کر ہی میسر آ سکتی تھی، اور وہ ہر روز بھیک مانگتی تھی۔ فاخراں کے ذہن میں اپنے اور ان دو پیٹوں کا خیال ہر لمحہ ایک نوکدار کانٹے کی طرح چبھتا رہتا تھا، اور کبھی کبھی تو یہ خیال رات کو سوتے میں بھی اسے مضطرب کر دیتا تھا۔ اور وہ بے اختیار بہن کے پہلو سے اٹھ کر، ہاتھ پھیلا کر وہی الفاظ کہتی جنہیں ہر روز ہزاروں مرتبہ اپنی زبان سے نکالتی تھی اور جنہیں بار بار دہرا کر اس کا گلا بیٹھ جاتا تھا۔

فاخراں اور اس کے گھر والے تقسیم سے پیشتر فیروز پور چھاؤنی میں رہتے تھے، جہاں اس کا باپ جلد سازی کا کام کرتا تھا اور روزانہ ڈیڑھ دو روپے کما لیتا تھا۔ وہ

وہ اگرچہ افیمی تھا اور روزمرّہ پانچ چھ آنے کی افیم اور تین چار آنے کا حلوہ ضرور کھا لیتا تھا تاہم گھر میں کبھی فاقے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ عبداللہ کے ہاتھ میں بڑی صفائی تھی، سکولوں کے طالب علم نئی جماعت کی کتابیں جلد بندی کے لیے اسی کو دیتے تھے اور سیزن میں تو وہ روزانہ چھ چھ سات سات روپے بھی کما لیتا تھا، یہ خوشحالی کی زندگی نہیں تھی تاہم بری زندگی بھی نہیں تھی۔

اچھا خاصا گزارا ہو رہا تھا۔ کہ فرقہ وارانہ فساد کے دوران میں ان لوگوں کو لاہور آنا پڑا۔ سوا چار ماہ کیمپ میں رہنے کے بعد انہیں گمٹی بازار کے ایک کونے میں رہنے کیلئے ایک چھوٹا سا مکان مل گیا اور یہاں ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

عبداللہ نے کسی نہ کسی طرح جلد سازی کا کچھ سامان اکٹھا کر کے اپنے مکان کے چبوترے پر کام شروع کر دیا، لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ اس کے بازار کے رہنے والوں کی زیادہ تعداد مہاجروں کی تھی۔ ان لوگوں کے سامنے تو صرف زندہ رہنے ہی کا سوال سب سے اہم تھا۔ ایسی حالت میں کتابوں کیطرف کون توجہ کرتا اور کون جلدیں بندھواتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ چھ دن میں چھ آنے بھی نہ کما سکا۔ اسے پیٹ بھرنے کو کسی نہ کسی طرح روٹی مل گئی، لیکن افیون نہ مل سکی۔ اس کی صحت پہلے ہی کافی کمزور تھی اور کمزور ہو گئی، اور سات دن بیمار رہنے کے بعد وہ چل بسا۔ اسکی موت کے بعد چند خدا ترس ہمسایوں نے اس بیکس و نادار خاندان کی پرورش کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ چند دن تو گزارہ ہوتا رہا مگر اس کے بعد ان کی توجہ میں کمی آنے لگی اس زمانے میں ہر ایک کو اپنی فکر پڑی تھی، چنانچہ گھر میں تنگ دستی فاقے کی حد تک پہنچنے لگی۔ اس وقت زندہ رہنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اتفاق کی بات ایک دن فاخراں اسی چبوترے پر، جہاں اس کے باپ نے کام شروع کیا تھا، بیٹھی گڑ کھا رہی تھی، کہ ایک شخص نے اس کے پھٹے پرانے کپڑوں سے یہ اندازہ کر کے کہ وہ بھکارن ہے اس کے ہاتھ میں دو آنے رکھ دیئے

——— یہ اس کی اور اس کی ماں بہن کیلئے زندگی کا نیا آسرا تھا، چنانچہ دوسرے دن وہ وہیں ہاتھ پھیلائے خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ دیر کے بعد اس کے ہاتھ میں پونے تین آنے جمع ہو گئے، اب تو وہ باقاعدہ بھیک مانگنے لگی، اور اپنے اندھے پن کا اعلان بھی کرنے لگی۔

جب تک وہ چبوترے پر بیٹھتی اس کے دماغ میں یہی خیال چھایا رہتا کہ کب سات آٹھ آنوں کے پیسے جمع ہوں گے اور کب وہ اندر جائیگی۔ جب تک پیسے اتنی تعداد میں جمع نہ ہوتے وہ اس خیال سے پریشان رہتی کہ اگر لوگوں نے کچھ نہ دیا تو اس کی ماں بہن کو فاقہ کرنا پڑے گا دونوں بھوکی رہیں گی ——— وہ خود فاقہ کر سکتی تھی مگر یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی مریض ماں اور بہن بھوکی سو جائیں۔

اور یہ سلسلہ سات ماہ سے جاری تھا۔ اور اب تو وہ اس مُعاملے میں اس قدر تجربہ کار ہو چکی تھی کہ جب بھی اس کے تیز اور تجربہ کار کانوں کو قریب آتے ہوئے پاؤں کی آہٹ سُنائی دیتی۔ فوراً اس کا ہاتھ پیسہ لینے کے لیے آگے بڑھ آتا، اور اسے یقین ہو جاتا کہ پاؤں کی آہٹ اس کے لیے خوشخبری کا پیغام لے کر آئی ہے۔ جیسے ہی سخت سکّہ اس کی ہتھیلی پر گرتا اسے اندازہ ہو جاتا کہ دینے والے نے اسے کیا دیا ہے، اور اسی نسبت سے اس کے ذہن میں خوشی کی کیفیت بھی لہرانے لگتی! مگر یہ کیفیت عارضی ثابت ہوتی۔

اتوار کی دوپہر تھی۔ فاخراں حسبِ معمول ہاتھ پھیلائے اپنی بے چارگی سے آنے جانے والوں کے جذبۂ رحم کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اتنے میں پاؤں کی آہٹ اس کے قریب آنے لگی۔ اس کے چہرے پر امید کی ننھی سی کرن لہرائی۔ اس کا ایک ہاتھ آگے بڑھ گیا اور وہ اس بات کا انتظار کرنے لگی کہ کب سکّہ اس کی ہتھیلی میں آئے اور "اللہ تیرا بھلا کرے" کا فقرہ رٹے۔ اس کا ہاتھ پھیلا رہا۔ کوئی سخت چیز اس کی ہتھیلی میں نہ گری ——— یہ کیا بات ہے۔ اس قسم کا حادثہ پہلے تو کبھی نہیں ہوا ہے۔ رحم دل شخص خیرات دے کر آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن یہ کون ہے جو اس کے پاس کھڑا ہے، وہ سمجھ رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے، اتنے میں آواز آئی ———

"کیوں لڑکی! تو مانگ کیوں رہی ہے؟"

عجیب سوال تھا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ مانگنے والا کیوں مانگا کرتا ہے! آج تک اس قسم کا سوال کسی نے نہیں کیا تھا۔ پہلی مرتبہ سوال کے الفاظ سن کر وہ خاموش رہی۔

"بے چاری اندھی ہے"۔ دوسری آواز نے کہا۔

اب اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے پاس ایک نہیں دو آدمی کھڑے ہیں۔

"لڑکی تو بتاتی نہیں، بھیک کیوں مانگ رہی ہے۔ گھر میں کمانے والا نہیں ہے؟"

"جی نہیں —— ابا مر گیا ہے، اماں بیمار ہے، کہاں سے کھائیں؟" اُس نے جواباً کہا۔

"اوہو —— تو گھر میں کوئی نہیں —— غریبوں کی حالت وہی ہے جو پہلے تھی بلکہ زیادہ خراب ہو گئی ہے۔" ایک آواز نے کہا۔ اس پر دوسری بولی۔

"اس مُلک کے امیروں کو آزادی ملی ہے غریبوں کو نہیں۔" دوسری آواز نے اُس کی ہتھیلی پر چار آنے رکھ دیئے۔

وہ انتظار کرتی رہی کہ کچھ اور باتیں بھی سُنے، مگر کوئی آواز اس کے کان میں نہ آئی۔ وہ جا چکے تھے۔ چار آنوں کو ہتھیلی میں تھامے وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس کے ہونٹوں سے دعائیہ فقرہ بھی نہ نکل سکا۔ "امیروں کو آزادی ملی ہے غریبوں کو نہیں ——" یہ الفاظ اس کے دماغ میں گُونج رہے تھے۔ یہاں تک کہ زینو نے کوٹھڑی کی دہلیز پر آ کر پوچھا۔

"فخو! کیا کر رہی تھی؟"

"کسی نے چوّنی دی ہے۔"

"چوّنی! اچھا!!" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"اور وہ کہتا تھا، امیروں کو آزادی ملی ہے غریبوں کو نہیں۔"

زینو کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو کوٹھڑی کی دہلیز پر محض اس لئے آئی تھی کہ اپنی کال کوٹھڑی سے نکل کر ذرا باہر کی دنیا کو بھی ایک نظر دیکھ لے اور بہن سے چند باتیں کر لے۔

"بڑا اچھا آدمی تھا۔" زینو نے کہا۔

"بڑا اچھا آدمی۔ اللہ کرے روز آیا کرے، آج زیادہ پیسے ہو جائیں گے۔" اور یکا یک گُڑ والی میٹھی روٹی کے تصوّر سے اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔

اُس دن اس کی جھولی میں پونے تیرہ آنے جمع ہو گئے —— اور اُس شام اُسے

کھانے کو میٹھی روٹی بھی مل گئی۔ میٹھی روٹی وہ بڑے شوق اور رغبت سے کھایا کرتی تھی، اور یہ خواہش کئی ہفتوں کے بعد کہیں جا کر پوری ہوتی تھی، روٹی کھانے کے بعد جب وہ چارپائی پر لیٹی تو اسے چار آنے دینے والے شخص کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ سوچنے لگی کہ اس فقرے کا مطلب کیا ہے کہ "اس ملک کے امیروں کو آزادی ملی ہے غریبوں کو نہیں۔" وہ سوچتی رہی۔ دیر تک سوچتی رہی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کا معصوم دماغ ایک اُلجھن میں مبتلا ہو گیا۔

زینو ابھی سوئی نہیں تھی، وہ ہلکے سُروں میں گا رہی تھی۔ "دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا ——— روتے ہیں تو ہنسنے کا پیغام نہیں ملتا۔"

"زینو!"

"کیا ہے ہسوتی کیوں نہیں۔" زینو نے جھنجھلا کر کہا۔ اس وقت اسے بہن کی دخل اندازی بہت بُری معلوم ہوئی۔

"غریبوں کو آرام کیوں نہیں ملتا؟" فاخراں نے زینو ہی کے الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ملتا، بس نہیں ملتا۔ میں کیا جانوں کیوں نہیں ملتا؟"

"زینو غریبوں کو آزادی نہیں ملی۔"

"اچھا!"

"آزادی کیا ہوتی ہے زینو؟"

زینو اور جھنجھلا گئی۔ "میں کیا جانوں۔"

"زینو بتا دو نا!" فاخراں کے لہجے میں لجاجت تھی۔

"آزادی ہوتی ہے آزادی۔ ہم عاجزوں کو کہاں؟ نہ پیٹ بھر کر روٹی ہے ——— نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ ابا مر گئے اب بھیک مانگنا پڑتا ہے۔ اور ———"

زینو نہ جانے کیا کچھ کہہ دیتی کہ ساتھ والی چارپائی پر سوکھی ہوئی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ زینو اس ڈر سے کہ ماں خفا ہو کر گالیوں کی بوچھاڑ نہ شروع کر دے۔ فقرہ مکمل کیے بغیر کروٹ بدل کر

جھوٹ موٹ خراٹے لینے لگی۔ کچھ دیر کے بعد زینو شاید سوگئی، مگر فاخراں کی آنکھوں میں نیند نہیں آتی تھی، وہ ابھی تک سوچ رہی تھی کہ غریبوں کو آزادی کیوں نہیں ملی ——— کب ملے گی غریبوں کو آزادی ——— سوچتے سوچتے آخر کار وہ تھک کر سوگئی۔

صبح جب فاخراں جاگی تو زینو معمول کے مطابق انگیٹھی میں آگ سلگا رہی تھی، ابھی چائے تیار ہونے میں کچھ دیر باقی تھی، وہ اُٹھ بیٹھی اور اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پھر وہی بات سوچنے لگی، غریبوں کو کب آزادی ملے گی۔ وہ یہ بات سوچ ہی رہی تھی کہ زینو انگیٹھی پر دیگچی رکھتے ہوئے بولی۔

"پھر سوچ رہی ہے آزادی کیا ہے؟"

"کیا ہے؟" ماں بولی۔

"یہ فاخراں۔"

"کیا ہے فاخراں کو؟ بیمار ہو گئی ہے؟" ماں کو ایک نئی فکر نے آدبوچا۔ چند ماہ پیچھے جب فاخراں بیمار ہو گئی تھی تو ان دونوں کو دو دو دن تک فاقہ کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ گھر میں جتنے پیسے تھے وہ سب فاخراں کے دوا دارو میں خرچ ہو گئے تھے۔ ایک ہی چیز ہو سکتی تھی یا دوائی آتی یا گھر میں روٹی پکتی۔ دوا آئی اور چولھا ٹھنڈا رہا۔

"نہیں بے بے یہ پوچھتی ہے غریبوں کو آزادی کب ملے گی؟"

ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری "ہم عاجزوں کو آزادی سے کیا واسطہ، زیادہ بیت گئی ہے تھوڑی رہ گئی ہے اسو بیت جائے گی۔" اور وہ کھانسنے لگی۔ "ہائے ——— مر گئی۔ چائے بن گئی ہے تو توے پر روٹی رکھ دے زینو!"

"اچھا بے بے۔"

اور جس وقت فاخراں مٹی کے کٹورے میں گرم گرم چائے کے اندر رات کی بچی ہوئی میٹھی روٹی کے ٹکڑے ڈالنے لگی تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ آزادی سے مراد اچھی اچھی چیزوں سے پیٹ بھرنا ہے۔ معمولی چیزوں سے نہیں، اور اچانک اسے نگہت یاد آگئی۔ نگہت فیروز پور میں اس کی سہیلی تھی جو ایک بہت بڑے مکان میں رہتی تھی۔ فاخراں جب کبھی اس کے مکان میں

جاتی تھی تو نگہت بتاتی تھی، یہ میرے ابا کا کمرہ ہے۔ یہ اماں کا ہے، یہ غسل خانہ ہے۔ یہ بھائی جان کا کمرہ ہے، یہ ڈرائنگ روم ہے ——— اور فاخراں شفاف دیواروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کمرے میں گھومتی رہتی۔ نگہت موٹر میں بیٹھ کر سکول جاتی تھی، دور ہی سے ہارن کی آواز سن کر وہ سمجھ لیتی کہ نگہت آگئی ہے، اور اب موٹر سے اترے گی اور اپنے کمرے میں چلی جائے گی۔ نگہت اُسے بتایا کرتی تھی، آج اس نے مرغ کا پلاؤ کھایا ہے، آج گھر میں ہرن کا گوشت پکا ہے اور آج اسے دو لال لال سیب ملے ہیں۔ یہ الفاظ سُن کر اس کے منہ میں پانی بھر آتا اور وہ تھوکنے لگتی جب نگہت اس کے پاس بیٹھتی تھی اور اس کی انگلیاں امیر سہیلی کی قمیص، کوٹ یا شلوار سے مس کر جاتیں تو اس کے ذہن میں وہ تمام تصورات جاگ اُٹھتے جو اس نے ریشم اور کمخواب کے الفاظ سُن کر ان کی مادی شکل کے بارے میں قائم کر رکھے تھے۔ کتنے نرم، ملائم اور شفاف ہوتے ہیں۔ یہ کپڑے جہاں انگلیاں رکھو پھسل جائیں اور اس وقت بھی آزادی کے بارے میں سوچتے وقت اس کی انگلیوں میں نگہت کے ریشمی کپڑوں کا لمس، اس کے ذہن میں پلاؤ کی لذت انگیز خوشبو اور اس کی زبان پر سیب کی قاشوں کی مٹھاس رچنے لگی تھی۔ وہ خیال کرنے لگی کہ جب غریبوں کو آزادی مل جائے گی تو وہ، اس کی ماں، اور اس کی بہن پھٹے پُرانے کپڑے نہیں پہنیں گی۔ رات کی باسی روٹیاں نہیں کھائیں گی۔ ایسی جگہ نہیں رہیں گی جہاں بارش کے وقت چھت میں سے پانی ٹپک ٹپک کر ہر طرف جمع ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ اچھے اچھے کپڑے پہنیں گی، انھیں کھانے کے لیے اچھی اچھی چیزیں ملیں گی، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے ہر روز صبح سویرے اٹھ کر رات کی بچی ہوئی سوکھی روٹی کھا کر لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑیں گے۔ تو آزادی کب ملے گی غریبوں کو، یہ بات اسے معلوم نہیں تھی۔ وہ سوچنے لگی اس شخص نے صرف یہ بتایا ہے کہ امیروں کو آزادی مل گئی ہے۔ غریبوں کو نہیں۔ اس نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ غریبوں کو کب آزادی ملے گی۔ اسے یہ بھی بتانا چاہیئے تھا، اب آئے گا تو میں اس کا ہاتھ تھام لوں گی اور اس وقت تک نہ جانے دوں گی۔ جب تک وہ مجھے یہ بات نہیں بتا دے گا۔ خیر وہ نہ آیا تو کریم ہی سے پوچھ لوں گی۔ وہ جمعرات کو روٹی دینے آیا کرتا ہے

کریم اس کے محلے میں رہتا تھا۔ اس کا نانا مر گیا تھا۔ اس لیے وہ جمعرات کو فاخراں کے گھر میں آکر روٹی دے جاتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ ایک حد تک مطمئن ہو گئی، اور اپنا فرض ادا کرنے کے لیے کوٹھڑی سے باہر نکلنے لگی۔

جمعرات کو جب وہ شام کے قریب جھولی میں پیسے سنبھالتے ہوئے اندر جانے لگی تو اس کے دماغ پر یہ آرزو چھائی ہوئی تھی کہ وہ کریم سے آزادی کا سوال ضرور پوچھے گی مگر کوٹھڑی میں قدم رکھتے ہی اسے رونے کی آواز سنائی دی۔ کبھی کبھی ماں زینو کو گالیاں دیتی تھی تو وہ بے چاری رو پڑتی تھی، اور اس وقت بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ بہن کو روتے سن کر اس کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک پڑتے تھے اور وہ بہن کو چپ کرانے کی کوشش کرنے لگتی۔ اس وقت وہ ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا بے بے؟"

"اس بے شرم کی بچی کو شرم نہیں آتی، جس بات سے منع کرو وہی کرتی ہے"

"کیا بات تھی؟" فاخراں نے پوچھا

"میں نے جب ایک بار کہہ دیا ہے کہ کریم آئے تو اس سے کچھ نہ کہا کرو، پھر یہ اس سے کیوں بولتی ہے۔ وہ چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ سارا دن رنڈیوں میں گھسا رہتا ہے۔"

"میں نے اس سے کچھ نہیں کہا، وہ کہتا تھا زینو کیا حال ہے۔" زینو نے روتے ہوئے کہا۔

"چپ حرامجادی کی چھوکری، بک بک کر رہی ہے"

دونوں لڑکیاں سہم کر چپ ہو گئیں۔ فاخراں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماں اتنا بگڑ کیوں رہی ہے۔ مگر وہ ڈر کے مارے بول نہ سکی۔ اس رات فاخراں دیر تک خدا سے دعا کرتی رہی، اللہ غریبوں کو آزادی دیدے تاکہ کریم روٹی لے کر ہمارے گھر میں آئے ہی نہ اور نہ ماں بیچاری زینو کو گالیاں دے ——— آزادی کا خیال آتے ہی ایک بار پھر اس کی انگلیوں میں ریشمی کپڑوں کا لمس اور اس کے دماغ میں پلاؤ کا ذائقہ لہرانے لگا۔

بہن سو رہی تھی، وہ اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھتے ہوئے بولی۔ "گھبراؤ نہیں زینو! آزادی مل جائے گی۔"

زینو سوتے میں چونک اُٹھی۔

"ہائے، مجھے ڈرا ہی دیا ہے تونے!"

"تو سو رہی تھی —— اچھا سو جا۔ میں کہہ رہی تھی اللہ ضرور ہمیں آزادی دیگا۔"

"خاک دے گا —— بے بے کو نہ جانے کیا ہو جاتا ہے —— اتنی گالیاں دیں، اتنی گالیاں دیں کہ ——"

"رو نہیں زینو! یہ سب کچھ اس وقت تک ہے جب تک آزادی نہیں ملتی۔ غریبوں کو آزادی آجائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو نماز کیوں نہیں پڑھتی؟"

"پڑھتی ہوں۔" زینو نے یونہی کہہ دیا۔

"اچھا —— تو دعا مانگا کر ناں اللہ غریبوں کو جلدی آزادی دے۔"

"اب سو رہو، نیند آرہی ہے مجھے۔"

زینو سو گئی مگر فاخراں دیر تک آزادی کے لیے دعا مانگتی رہی۔

سردی بڑھتی جا رہی تھی، اور گھر میں ایک کمبل اور ایک لحاف کے سوا سردی روکنے کے لیے اور کچھ بھی نہ تھا۔ کمبل کہیں کہیں سے پھٹا ہوا تھا، اور ماں یہی پھٹا ہوا کمبل اوڑھ کر سوتی تھی۔ کئی بار زینو نے کہا۔ "بے بے تو بیمار ہے لحاف تو لے لے اور کمبل ہمیں دیدے۔" مگر ماں مانتی ہی نہیں تھی۔ فاخراں کی اب یہ کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کرے۔ چنانچہ وہ زینو کے بلانے پر بھی باہر بیٹھی رہتی کہ چند پیسے اور مل جائیں اور لحاف کے لیے ذرا اور گنجائش نکل آئے۔ روز جتنے پیسے جمع ہوتے تھے ان میں سے آدھے پیسے لحاف کے لیے محفوظ کر لیے جاتے تھے۔ پہلے ہر روز سالن ضرور بنتا تھا۔ مگر اب مولی کے ساتھ ہی روٹی کھالی جاتی تھی۔ اور سالن کے پیسے بھی بچا لیے جاتے تھے۔ فاخراں اپنی زندگی کو کچھ اہم سمجھنے لگی تھی۔ کیوں کہ اسی کے کمائے ہوئے پیسوں سے تین پیٹ بھرتے تھے۔ اور لحاف خریدنے کے لیے پیسے بھی جمع ہو رہے تھے۔ اس احساس نے اس کے اندر کام کرنے کے جذبے کو اور تیز کر دیا، اور رات دن وہ اسی خیال میں غلطاں رہنے لگی کہ کب گھر میں لحاف آئے گا اور کب اس کی بیمار ماں سردی سے محفوظ ہو گی۔

جب معقول رقم جمع ہوگئی تو ماں زیادہ بیمار ہوگئی، اس وقت جو کچھ لحاف کے لیے جمع کیا گیا تھا وہ دوا دارو پر خرچ ہونے لگا۔ چند دن میں گھر کی ساری پونجی خرچ ہوگئی، اور اس کے ساتھ ماں کی زندگی کا اثاثہ بھی ختم ہوگیا۔ ماں مرگئی تو دونوں لڑکیوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اللہ دتہ حلوائی جس نے فاخراں کی ماں کے مرنے پر کفن دفن کا انتظام کیا تھا۔ اپنی بیوی اور بوڑھی بہن سمیت فاخراں کے یہاں آگیا۔ اب فاخراں کو بھیک نہیں مانگنا پڑتی تھی۔ کیونکہ گھر کا سارا خرچ اللہ دتہ پورا کرتا تھا۔

فاخراں چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھی رہتی تھی، اور کسی سوچ میں غرق رہتی تھی۔ سوچتے سوچتے کبھی چہرے کا رخ چھت کی طرف پھیر لیتی اور کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لرزنے لگتی۔

اللہ دتہ کو دل کے دورے پڑتے تھے۔ جب دورہ پڑتا تھا تو پیلا زرد ہو جاتا تھا، اور دو دو تین تین دن تک دکان پر نہیں جاسکتا تھا۔ معمولی حکیموں ڈاکٹروں سے کئی مرتبہ علاج کرا چکا تھا۔ مگر فائدہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ کہتے تھے تمہیں کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیئے۔ لیکن اس کی محدود آمدنی بڑے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت نہیں دیتی تھی —— فاخراں کے گھر میں آکر دورہ پڑا تو اس کے پاس معمولی ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے بھی پیسے نہ تھے۔ اللہ دتہ کی بیوی نے اپنی سونے کی آخری انگوٹھی بھی بیچ دی۔ ڈاکٹر کو گھر پر بلایا گیا۔ مریض کی حالت میں کچھ افاقہ بھی ہوا مگر یہ افاقہ عارضی تھا، کیونکہ تیسرے دن چار بے کس عورتوں کا یہ واحد سہارا ٹوٹ گیا۔

چار پیٹ روٹی سے محروم ہوگئے اور چار تن اپنی عریانی چھپانے کے لیے کپڑے کو ترسنے لگے۔

مرحوم اللہ دتہ کا ایک بھانجا کراچی میں رہتا تھا، اسے جب اس حادثے کا علم ہوا تو وہ چالیس روپے ماہانہ بھیجنے لگا۔ اس طرح گزارہ ہونے لگا۔

ایک دن فاخراں اندر آئی تو اسے بہن کی سسکیاں سنائی دیں۔ چند دن سے وہ بہن کو پریشان محسوس کر کے پریشان ہورہی تھی، اور اب تو بہن کو روتے دیکھ کر اس کا کلیجہ

پھٹنے لگا۔ فاخراں نے بہن کو بلایا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اللہ دتہ کی بیوی گرج کر بولی ——

"اسے کیا کہتی ہے نخرہ! یہ تو نواب زادی ہے نواب زادی۔ دماغ عرش پر پہنچ گیا ہے سمجھتی ہی نہیں کچھ، غریبی میں یہ نوابی کبھی دیکھی نہ سُنی"۔

"کیا نوابی ہے خالہ جان؟" فاخراں نے آنسو روکتے ہوئے کہا۔

"یہ نوابی شان نہیں تو اور کیا ہے، کہتی ہے میراں بخش سے نکاح نہیں کروں گی میرے دادا جلتا ہے، توبہ! اس کی تو آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔ کوئی پوچھے اس طرح گذارہ کیسے ہوگا۔ کون اس نواب کی چھوکری اور اندھی بہن کو روٹی دے گا۔ میں پوچھتی ہوں روٹی کپڑے کا کیا بندوبست ہوگا؟"

"پر خالہ جان! —— تو کیوں ہماری فکر کرتی ہے —— جس طرح ہوگا گذارہ کر لیں گے"۔ زینو روتے ہوئے بولی۔

"گذارہ کر لیں گے —— کس طرح گذارہ کر لیں گے۔ آسمان سے اترے گا من وسلویٰ تیرے لیے۔ اندھی بہن کب تک بھیک مانگے گی۔ میں نے تو اسے منع کر رہا ہے۔ اس میں ہماری بے عزتی ہے۔ ہم یہاں نہ ہوتے تو جو دل میں آتا کرتیں، پر اب ہم لڑکی کو بھیک نہیں مانگنے دیں گے"۔

اللہ دتہ کی بیوی تڑپ کر بولی۔

"زینو تو سمجھتی کیوں نہیں؟ اپنی حالت دیکھ، تجھ کنگال کو کون بیوی بنائے گا"۔ اللہ دتہ کی بہن بولی۔

"خواہ کچھ ہو تجھے میراں بخش سے نکاح کرنا ہوگا"۔

اللہ دتہ کی بیوی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ زینو سسکیاں لیتے لیتے خاموش ہو گئی۔ مگر فاخراں کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ ماں کی موت کا خاموش غم، اپنی بے چارگی اور بہن کا دکھ —— یہ تینوں احساس ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اس کے دل و دماغ پر ٹوٹ پڑے، اور اس کی بے نور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا۔ دیر تک بہتا رہا۔ آخر بہن نے اسے سینے سے لگا لیا "نہ رو بہن غریبوں کو آزادی ملنے والی ہے۔ اللہ غریبوں کو ضرور آزادی دے گا"۔ اور

اس کے بہتے ہوئے آنسو رُک گئے۔

چند دن کے بعد زینو گھر میں نہیں تھی۔ اللہ دتہ کی بیوی اور بہن اس کے لیے سخت بُرے الفاظ استعمال کر رہی تھیں۔ اللہ دتہ کی بیوی کہہ رہی تھی "زینو حرام زادی نے اپنا منہ کالا کر لیا ہے۔ کریم کے ساتھ چلی گئی ہے۔" اور اللہ دتہ کی بہن کہہ رہی تھی: "مجھے پہلے ہی علم تھا، یہ لڑکی خاندان کو ڈبو کر رہے گی۔ خود کو نواب زادی سمجھ رہی تھی۔ آخر وہی ہوا نا۔ اسی لیے تو میراں بخش سے نکاح نہیں کرتی تھی۔"

گھر میں جو عورت بھی آتی تھی زینو کو ضرور گالیاں دیتی تھی۔ فاخراں کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ مگر وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کی بہن نے کوئی نہایت بری حرکت کی ہے۔

بہن کی جدائی نے اس کا برا حال کر دیا۔ جب کبھی وہ اللہ دتہ کی بیوی سے کہتی۔ "خالہ! زینو کہاں ہے، مجھے وہاں بھیج دو۔" تو وہ گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتی۔ فاخراں کے لیے چپ رہنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

وقت کا پہیہ اس کے نحیف جسم کو کچلتا ہوا گزر رہا تھا۔ اور وہ خاموش تھی۔ چپ چاپ اپنی اندھی آنکھوں سے خلا کو گھورتی رہتی —— چپ چاپ کسی چیز کا انتظار کرتی رہتی۔ ایک دن اس نے سنا کہ ایک عورت اللہ دتہ کی بیوی سے کہہ رہی تھی ——

"زینو ٹبی[1] میں ہے ——"

یہ سنتے ہی اللہ دتہ کی بیوی زینو کو بے نقط سنانے لگی۔ فاخراں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور رات جب وہ چارپائی پر لیٹی تو رو رو کر دعا کرتی رہی۔ "اللہ! مجھے میری بہن سے ملا دے۔" اس کی یہ دعا قبول ہو گئی، کیونکہ ایک ہفتے کے بعد وہ یونہی گھر سے باہر بیٹھی تھی کہ کسی نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا۔

"چل تجھے تیری بہن بلاتی ہے۔"

"زینو!" وہ بے تاب ہو کر بولی۔

---

[1] ٹبی، لاہور کا وہ حصہ جہاں طوائفیں رہتی ہیں

"ہاں"

"اچھا! ـــــ مجھے لے چلو۔"

کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ٹانگے میں بٹھا دیا گیا اور جب تانگہ کہیں رکا تو وہ زینو کی گود میں تھی۔

"ہائے، تو مجھے چھوڑ کر کیوں آ گئی تھی زینو؟"

"تو اچھی ہے نا فخو؟"

"میں اچھی ہوں یا نہیں تجھے کیا، تُو تو مجھے چھوڑ کر آ گئی تھی ـــــ وہ سب لوگ تجھے گالیاں دیتے تھے، تو آجکل کیا کرتی ہے؟ ٹبی میں کیا کرتی ہے؟"

ـــــ لوگ تجھ پر لعنت بھیجتے تھے۔ خالہ نے تجھے بد دعائیں دی تھیں ـــــ مر جائے؟"

زینو کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اور فاخراں ان آنسوؤں سے بے خبر تھی۔

"تجھے بھوک لگی ہے فخو؟" بہن نے پوچھا۔ یہ سن کر فاخراں تمام باتیں بھول گئی۔

"ہاں ـــــ کھانے کو کیا ملے گا؟"

"بڑی اچھی اچھی چیزیں، پلاؤ کھاؤ گی ناں!"

"پلاؤ؟ ـــــ ہیں زینو!" اور یہ کہتے ہوئے فاخراں کا ہاتھ زینو کی قمیص سے مس کرنے لگا۔

"یہ تو بڑی اچھی قمیص ہے؟"

"تو بھی ایسی قمیص پہنے گی؟"

"اچھا ـــــ"

یکایک اس کے کانوں میں موٹر کے ہارن کی آواز گونج اٹھی۔ اس کی انگلیوں میں شفاف اور ملائم لمس جاگ اٹھا۔ اس کے ذہن میں سوئی ہوئی خوشبو بیدار ہو گئی ـــــ اور وہ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی ـــــ تو زینو ٹبی کے غریبوں کو آزادی مل گئی ہے ـــــ ہے نا ـــــ"

زینو نے اس کا کوئی جواب نہ دیا

فاخراں کی اندھی آنکھوں میں خوشی کی لہریں ناچنے لگیں اور زینو دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتی رہی:

درونِ زندگی

کمرے کے سب دروازے، کھڑکیاں اور روشندان ایک مدت سے بند پڑے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کمرے کے اندر فضا پر ہر وقت ایک بوجھل، سرد اور بھیانک تاریکی رینگتی رہتی اس گہرے اندھیرے میں نہ کبھی سورج کی حیات آفریں شعاعوں نے سانس لینے کی کوشش کی تھی۔ اور نہ کبھی چاند تاروں کی ٹھنڈی روشنی نے اسے چھوُا تھا۔ اور تو اور ہوا کی لہریں بھی کسی وقت اندر آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ شاید انھیں بھی کمرے کی نحوست آثار منجمد تیرگی سے ڈر لگتا تھا۔

یہ کمرہ زندگی کی تمام ہمہ زائیوں سے بالکل محروم ہو چکا تھا ——— اور اگر اس میں زندگی کا کوئی نشان تھا بھی تو صرف ان ننھے ننھے نظر نہ آنے والے ہزاروں ذرّات کی بدولت جو ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک فضا میں دن رات سرکتے رہتے تھے۔ ان میں بھی حرکت اس وقت پیدا ہوتی تھی جب کبھی ہوا کی کوئی لہر یا سورج کی کوئی کرن دروازے کے سوراخ یا دیوار کی دراڑ میں سے اندر آجاتی۔ اس کے علاوہ ان میں کبھی کسی قسم کا اضطراب یا ہلچل نظر نہیں آتی تھی۔ وہ تاریکی کے جزو بن کر رہ گئے تھے ——— ان میں انفرادیت نام کو باقی نہ رہی تھی! ———

یہی ماحول طاری تھا کہ ایک دن اسی تاریک کمرے کے ایک تاریک تر گوشے میں ایک چھوٹا سا ذرّہ نڈھال ہو کر زمین کے بالکل قریب پہنچ گیا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں بولا ———

"توبہ، کس قدر اندھیرا ہے، کہیں بھی روشنی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ نہ جانے کب اس سے نجات ملے گی؟"

یہ الفاظ سن کر ایک بوڑھے ذرّے نے حقارت انگیز قہقہہ لگایا۔

"خوب! ناچیز ذرے ہو کر روشنی کی سوچ رہے ہو۔ بیٹا! ہم اندھیرے کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ اندھیرے ہی سے وابستہ رہیں گے، ہمارا وجود تاریکی سے الگ نہیں ہے!"

"ہمیں کبھی نجات نہیں ملے گی ——— کبھی اس اندھیرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے!" ننھا ذرہ بولا۔

"کبھی نہیں ——— میری مانو ایسی بے ہودہ باتیں نہ سوچا کرو۔ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم ایک حقیر ذرّے ہو۔"

یہ کہہ کر بوڑھے ذرّے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور ننھا ذرّہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ کچھ اور پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ روشنی دیکھی تھی ——— اور اُس وقت اس کا سینہ ایک شدید اور تند و تیز ولولے کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس کی رگ رگ میں ایک لذت انگیز سنسنی سی دوڑ گئی تھی، اور اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک حقیر، بے مایہ وجود نہیں ہے ——— اپنی دنیا میں اس کی کچھ اہمیت بھی ہے ——— وہ کچھ کر بھی سکتا ہے، اس میں کچھ کر سکنے کی ہمت بھی ہے، اس کے سامنے ایک وسیع ایک روشن دنیا پھیلی ہوئی ہے، جس میں وہ پرواز کر سکتا ہے ——— ناچ سکتا ہے ——— اُڑ سکتا ہے ——— گا سکتا ہے ——— مگر افسوس' اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے نے اسے دروازے سے پیچھے دھکیل دیا اور کچھ دیر کے بعد اس نے اپنا سر اُٹھایا تو اس کے اردگرد بے کنار اور ہمہ گیر تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور اس کے جسم کا ہر عضو بری طرح دُکھ رہا تھا۔ اس کے سارے حسین خواب چٹان طرح سخت اندھیرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئے تھے اور بظاہر تاریکی سے نکل کر روشن دنیا میں جانے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم شدید سے

شدید مایوسی بھی اس مشعل کو بجھانے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ جو ایک مرتبہ روشنی دیکھنے کے بعد اس کے دل کی گہرائیوں میں جل چکی تھی ——— اسے توقع تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور اندھیرے کی تہوں سے نکل کر باہر کی لامحدود دُنیا میں پہنچ جائے گا ——— اور وہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک اسی گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔

بوڑھے ذرّے کے تلخ اور ہمت شکن الفاظ نے اس پر گہرا اثر کیا تھا، اس لیے وہ اپنے وجود کو سنبھال نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی، وہ بے بس ہو کر مجروح ہو کر ——— چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسی حالت میں یکایک بوڑھے ذرّے نے حسبِ معمول کرخت لہجے میں کہا۔

"تمہارا خیال ہے گھر کی مالکن پھر کبھی یہاں آجائے گی، اور کمرے کا دروازہ کھول دے گی؟"

ننھے ذرے نے کوئی جواب نہ دیا ——— دراصل یہ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکے تھے، اور اگر وہ یہ الفاظ سن بھی لیتا جب بھی کچھ نہ کہہ سکتا، مایوسی نے اسے بے دم کر دیا تھا۔

بزرگ ذرے نے آنکھیں جھپکا کر کہا ———

"گھر کی مالکن کبھی نہیں آئے گی، یہ خیال اپنے دل سے نکال دو، اس زمانے میں گھر کا کچھ سامان یہاں پڑا تھا، اور وہ یہی سامان لینے کے لیے یہاں آگئی تھی۔ ورنہ وہ اس بدبودار فضا میں کبھی آنے کا ارادہ نہ کرتی۔ سُنا بیٹیا! تم سُن نہیں رہے کیا؟"

ذرّہ خاموش تھا۔

"غائب کہاں ہوگئے ہو؟ ——— اچھا بھئی تمہاری مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" بڑے ذرے کی بوڑھی آواز ایک لمحے کے لیے تھرتھرائی، اور پھر گہرے اندھیرے میں جذب ہوگئی۔

کچھ دیر گزرنے پر ننھے ذرے کا شعور بیدار ہونے لگا۔ اسے وہ واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد آگیا جس سے وہ ابھی ابھی دوچار ہوا تھا۔ اس نے بزرگ ذرے کی آواز نہیں سنی۔ تاہم وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے ذرے کس انداز میں سوچا کرتے ہیں، اور روشنی کی تمنا کو کتنا بے ہودہ خیال تصوّر کرتے ہیں۔

ذرّوں کی دُنیا کا یہ سب سے ننھا وجود چند لمحے مسلسل حسرت و مایوسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہ پوری طرح مایوس ہو جانا چاہتا تھا، مگر ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خلش سی، ایک اضطراب سا موجزن تھا۔ اس خلش اور اضطراب میں روشنی کی آرزو کے علاوہ ایک قسم کا باغیانہ احساس بھی کار فرما تھا۔ اپنے آپ کو وہ اس قدر حقیر نہیں سمجھتا تھا کہ ایک مرتبہ زمین پر گر کر دوبارہ اٹھنے کا نام ہی نہ لے، اور روشنی کی تمنا کو ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دے۔

اُس سے بہت دور کافی بلندی پر اندھیرے کے سینے میں روشنی کی ایک نہایت مدھم سی، ننھی سی لکیر لرز رہی تھی، اور یہی لکیر اس کی نظر کا مرکز بن گئی —— نہ صرف مرکز بن گئی، بلکہ اس کے اندر زندگی کی نئی امنگ اور نئی ترنگ بھی پیدا کرنے لگی —— وہ مایوسی کی سطح سے بُلند ہو رہا تھا، اور سوچ رہا تھا! —— "آخر گھر والے اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھول کیوں نہیں دیتے، انھیں ہم سے کیا دشمنی ہے، وہ ہمیں کیوں اس محدود فضا میں بند کر کے روشنی سے محروم کر رہے ہیں —— ؟"

کافی دیر کے بعد وہ گرتا پڑتا اوپر آگیا۔ اب وہ اپنے سامنے بزرگ ذرے کو دیکھ رہا تھا وہ بوڑھے سے یہ سوال پوچھنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ بوڑھا اسے مایوس کر دے گا —— اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بزرگ ذرہ اس کا خیال بھانپ گیا اور کہنے لگا۔

"میں نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ ہم تاریکی کا ایک حصہ ہیں —— آخر سوچو روشنی کے ساتھ ہمارا کیا واسطہ! تم بالکل ننھے ہو، بے فائدہ اس چیز کے لیے بے تاب ہو جسے کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ میری مانو، اس قسم کی خیال نہ کیا کرو، سنا تم نے بیٹا!"

ننھا ذرّہ اب خاموش نہ رہ سکا۔ جھٹ بول اُٹھا۔

"وہ لوگ دروازہ کھول کیوں نہیں دیتے۔ دروازہ کھلے گا تو روشنی خود بخود اندر آجائے گی۔"

"بہت خوب بھئی!" بزرگ ذرے نے خوفناک قہقہہ لگایا "تم انسان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بے تابی کا خیال کر کے دروازہ کھول دے گا، یہ تمہاری بھول ہے، تم نے

انسان کو سمجھا ہی نہیں ـــــ اسے ہم حقیر ذروں کی کیا پروا ہو سکتی ہے ـــــ اگر تم نے اس خواہش کو دماغ سے نہ نکالا، تو ایک دن تمہارا دم گھٹ جائے گا، اور تم مر جاؤ گے!"

اس وقت ذرّے کی آنکھوں پر مایوسی کے سائے چھا گئے۔

تاریک فضا اور تاریک ہو گئی، روشنی کی وہ ننھی لکیر بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ذرے کا دم سچ مچ گھٹنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو ہوا میں چھوڑ دیا ـــــ اس حالت میں اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے، اور کیا ہونیوالا ہے ـــــ

پستی سے لے کر انتہائی بلندی تک چاروں طرف گہری تاریکی مسلّط تھی، اس تاریکی میں اس کے بزرگ، اس کے ہم عمر، لاکھوں ذرّے اپنی مختصر سی دُنیا میں گردش کر رہے تھے۔ آگے بڑھتے تھے، ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور پھر نیچے چلے جاتے تھے، ان میں کئی ایسے بھی ہوں گے جنھیں روشنی کی تمنّا ہو گی۔ جو وسیع اور روشن دنیا میں پرواز کرنا چاہتے ہوں گے ان کی خواہشیں سِسک سِسک کر دم توڑ دیتی ہوں گی، اور نوجوان ذرّہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ راستے کی مشکلات کا مقابلہ کر کے دروازے تک پہنچ جانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے اوپر جانے کی کوشش کی تھی مگر طاقتور ذرّوں نے اس کا راستہ روک لیا تھا ـــــ وہ ایک بے وقوف اور ضدی بچے کو ہلاکت آفریں تگ و دو سے بچانا چاہتے تھے ـــــ کم از کم ان کا نقطۂ نظر یہی تھا، اور ان کی باتوں سے بزرگانہ شفقت نمایاں تھی۔

"کیا وہ اسی طرح ختم ہو جائے گا" ـــــ اس نے سوچا اور روشنی کا تصور پوری شدت کے ساتھ اس کے دل میں جاگ اٹھا، اور وہ اپنے اندر ایک نئے ولولے کا ہیجان محسوس کر کے بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔

نئی فضاؤں میں گردش کرتے ہوئے ذرّے جب اُس سے ٹکراتے تو وہ ایک دم کہیں سے کہیں جا پہنچتا۔ ایک مرتبہ تو وہ اسی پستی میں پہنچ گیا جہاں سے نکل کر وہ اوپر اٹھا تھا۔ اگرچہ وہ چند لمحے وہاں ٹھہرا لیکن اس مختصر سے وقفے میں بھی اس کے بزرگوں

اور ساتھیوں نے طعن و تشنیع سے اُسے پریشان کر دیا۔
ایک بزرگ کہنے لگا۔

"دیکھو ایسی بیہودہ حرکت نہ کرو، تم نہیں جانتے کہ ——"

اس سے پہلے کہ بزرگ کا فقرہ مکمل ہو وہ تیزی سے اوپر کے کرّے میں آگیا خوش قسمتی سے ہوا کا ایک جھونکا اُدھر آنکلا اور اس جھونکے نے اسے فضا کے اُس حصّے میں پہنچا دیا جو کافی بلند تھا، اور جہاں وہ پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر ذرا رُک کر اس نے نیچے دیکھا، دور اس کے پست ہمّت ساتھی کلبلا رہے تھے، اور اپنی محدود تاریک دُنیا میں بے معنی گردش کر رہے تھے۔ یہاں سے اپنا پہلا مقام اسے اس قدر پست نظر آیا کہ وہ اپنی کامیابی پر حیران رہ گیا —— مگر حیرت و مسرت کے یہ لمحے بہت جلد ختم ہو گئے۔ کیوں کہ اب وہ جن ذرّوں کے درمیان موجود تھا وہ اسے اپنا ساتھی نہیں سمجھتے تھے بلکہ تاریک پستیوں کا باشی کہتے تھے۔ اور اسے اپنے کرّے میں آنے کی اجازت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ نئے ساتھی بجائے اس کے کہ اس کی ہمّت و عزم پر تحسین کہیں الٹا اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک ذرّے نے تو صاف صاف کہہ دیا۔

"بھئی! یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ یہاں تک پہنچ گئے ہو۔ اب فوراً واپس چلے جاؤ تمہارا مقام اس پستی میں ہے جہاں سے تم آئے ہو۔ اگر ہم میں سے کسی طاقت ور وجود سے تمہارا تصادم ہو گیا تو ایک ہی لمحے کے اندر فنا ہو جاؤ گے۔ یا زخمی ہو کر نیچے گر پڑو گے، اور پھر زمین کے ذروں میں جذب ہو کر رہ جاؤ گے۔ اور پھر کبھی تم نہیں اٹھ سکو گے!"

باقی ذرّوں نے بھی یہی کوشش کی کہ وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر واپس چلا جائے لیکن وہ تھکاوٹ کے باوجود اوپر جانے لگا۔ یہاں تک کہ ایک نئی بلندی پر پہنچ گیا۔

اس بلندی پر اس کی ملاقات ایک تیز رو مسافر سے ہو گئی۔ یہ ذرہ بھی اسی کی طرح ایک دور دراز گوشے سے نکل کر بالائی حصے کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ خوشی خوشی اس کا ہمسفر بن گیا۔

ایک دن وہ دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے کہ یکایک اس کا ساتھی چیخ اٹھا۔

"آندھی"

"کیا؟" نوجوان ذرہ آندھی کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔

"باہر آندھی آرہی ہے۔ یہ شور سن رہے ہونا؟" اس کا ساتھی بولا۔

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ باہر وسیع دنیا میں بھی اندھیرا چھا گیا ہے۔ اتنی جلدی رات کیونکر آگئی ہے آج؟"

اس کے ہمسفر نے بتایا "آندھی تیز و تند ہوا کو کہتے ہیں، اگرچہ کمرے کے سب دروازے بند ہیں، تاہم آندھی کے جھونکے اندر بھی آجائیں گے اور اگر ہم کسی جھونکے کی زد میں آگئے تو وہ نہ جانے ہمیں کہاں پھینک دے اور ——— یہ بھی خبر نہیں کہ ——"

یکایک اِدھر اُدھر ایک ہلچل سی مچ گئی ——— ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ چھوٹے ذرّے نے محسوس کیا کہ سب ذرے مل کر اسے پستیوں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ خوف سے اس نے آنکھیں بند کرلیں، اور اس کا تھکا ہوا وجود اس طرح گردش کرنے لگا جیسے کسی طاقت ور چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

کافی دیر کے بعد جب وہ ذرا سنبھلا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک تنکے کے سرے پر چمٹا ہوا ہے۔ اور یہ تنکا دیوار کی طرف جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دیوار کے ساتھ جا لگا ——— فضا میں ابھی تک اندھیرا مسلط تھا، اور لحہ بہ لحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد جتنے ذرے موجود تھے وہ سب کے سب تھک کر سو رہے تھے ——— ایک بڑا مایوس کن خیال اس کے ذہن میں آیا ——— کیا میری زندگی حرکت اور حرارت سے محروم ہوگئی ہے اور کیا میں اپنا سفر پورا کر کے پھر اسی ناپیدا کنار تاریکی کا جزو بن رہا ہوں۔ جس کے بطن سے پیدا ہوا تھا ——— کاش میں اس ناکامی سے پیشتر صرف ایک مرتبہ دروازے سے نکل کر روشنی کے سیلاب میں چھلانگ لگا سکتا ——— صرف ایک مرتبہ

"روشنی میں جانے کا مزہ دیکھ لیا ہے نا!" قریب سے ایک بوڑھی آواز آئی۔

"کیا مطلب؟" اس نے کہنے والے کی طرف مخاطب ہوئے بغیر پوچھا۔

"مطلب کیا ــــــ شکر کرو اس کمرے کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ ــــــ اگر ایک بھی کھڑکی کھلی رہتی تو ہم میں سے کسی کا وجود بھی سلامت نہ رہتا۔ ہم مٹی کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو گئے ہوتے۔ ہمیں بند دروازوں اور کھڑکیوں نے بچا لیا ہے۔"

بات بالکل درست تھی۔ آندھی کا ایک ہلکا سا جھونکا اندر آسکا تھا۔ اور اس ہلکے سے جھونکے ہی نے ایک ہلچل مچا دی تھی۔ اگر وہ باہر ہوتا یا دروازہ کھلا ہوتا نہ جانے کیا ہوتا، وہ مایوس تھا مگر اب کے مایوسی میں کچھ اطمینان بھی تھا۔

وقت چپ چاپ گزرتا رہا، اور ایک دن پھر اس نے یکایک بلندی پر ایک روشن نقطہ دیکھ لیا۔ اس کے سینے میں سوئی ہوئی امید جاگ اٹھی "ہائے وہ باہر کی دنیا کس قدر وسیع، کس قدر خوبصورت ہے" اس نے آہ بھر کر کہا، اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اوپر آگیا ہے، ایک نئے مقام پر۔

"ننھے بھائی کیا کر رہے ہو؟"

اس نے دائیں طرف دیکھا، اس کا پہلا باہمت ہم سفر پیار بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ سفر جاری رکھنے کی امنگ از سرِ نو اس کے اندر پیدا ہو گئی۔

ابھی اس نے کچھ کہا نہیں تھا ــــــ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اتنے میں اس کا ہمسفر بولا۔

"مجھے افسوس ہے میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا، دیوار کے ساتھ جالا لٹک رہا ہے، میں اس میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔ نہ جانے کب تک اس میں گرفتار رہوں گا۔ ایک نہ ایک دن کہیں سے ہوا کا جھونکا آئے گا اور مجھے اس قید سے رہائی دلا دے گا۔ جب تک وہ جھونکا آئے میں اس بوجھل غبار سے نہیں نکل سکتا۔

"کوشش تو کرو!"

"کوشش تو کرتا ہی رہوں گا، تم تہا روشنی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ کبھی نہ کبھی میں بھی آ جاؤں گا ــــــ ضرور آؤں گا۔"

"نہیں، جب تک تم ساتھ نہیں چلو گے میں یہیں رہوں گا" یہ کہتے ہوئے چھوٹے

ذرے کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

دوسرا ذرہ بولا "اس کا خیال نہ کرو، اس وقت فضا کافی پرسکون ہے۔ تمہیں راستے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی!" دوسرے ذرے کے لہجے میں عزم اور ارادے کی مضبوطی جھلک رہی تھی۔

اپنے ہمسفر سے محرومی کے احساس نے اس کے سینے میں درد کی لہریں دوڑا دیں۔ اور اس کے ذہن میں ایک چبھن سی ہونے لگی۔

"یہیں ٹھہر جاؤں یا روانہ ہو جاؤں ——— وہ سوچنے لگا۔ اس وقت فضا واقعی پرسکون تھی، اور دور بلندی پر تاریکی کی پیشانی سے روشنی کی ایک لہر پھوٹ رہی تھی۔

اس نے اپنے ساتھی کو آخری بار دیکھا اور اوپر پرواز کرنے لگا۔ وہ تاریک فضا میں گر گر کر اڑتا رہا، اڑ کر اڑ کر گرتا رہا۔ کبھی طاقت ور ذروں سے ٹکرا کر بالکل زمین کے قریب پہنچ جاتا اور کبھی مسلسل تگ و دو سے کسی نئی فضا کو چھونے لگتا۔ نئی فضا کے ذرے اسے حقیر اور اجنبی سمجھ کر ——— اپنی دنیا سے نکال دیتے۔ متکبر ذرے اس کا راستہ روک لیتے۔ اس کا مذاق اڑاتے نہ صرف یہ بلکہ اسے زخمی کرکے نیچے بھی گرا دیتے۔ ہر لمحہ بڑھتی ہوئی مشکلات کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو جاتے، اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ لیکن اس کے دل میں روشنی میں جانے کی جو تمنا بیقرار تھی اس کا شعلہ کسی صورت میں بھی، کسی حال میں بھی نہیں بجھتا تھا۔ یہی وہ شعلہ تھا جس کی حرارت نے اسے ہر لمحہ مصائب کے ہجوم میں بھی سرگرم سفر رکھا تھا، اور جو اسے ہر گھڑی ایک حسین، ایک شاداب دنیا کے خواب دکھاتا رہا تھا۔ جب کبھی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑتا تو یہ رنگین خواب چپکے سے اس کے ذہن میں جھلملا اٹھتا اور وہ اسی حالت میں اپنے مجروح جسم کے ساتھ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگتا۔

وہ اڑتا رہا ——— یہاں تک کہ ایک دن اس کی آنکھیں حیرت انگیز مسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کثیف اندھیرے کی حدیں ختم ہو رہی تھیں۔

اور اس کی ننھی ننھی آنکھوں کے سامنے دور تک روشنی اور تاریکی کا ایک وسیع پھیلاؤ سا نظر آرہا تھا۔ جس میں لاکھوں صحت مند ذرّے ناچ رہے تھے۔ اس پھیلاؤ اور اس کے درمیان ابھی تاریکی حائل تھی —— وہ ٹھیر نہ سکا، تیزی سے آگے بڑھنے لگا —— برابر آگے بڑھتا گیا۔

اب اس پر ایک نیم بے ہوشانہ سی کیفیت طاری رہی۔

وہ کہاں ہے، کس دُنیا میں پہنچ گیا ہے، کیا وہ سنگین دروازے سے باہر نکل آیا ہے۔ یا ابھی تک اُسی دم گھٹنے والی تاریک فضا میں لڑکھڑا رہا ہے —— اسے کچھ سوجھتا نہیں تھا —— کچھ دیر کے بعد وہ اپنے نئے ماحول سے آشنا ہونے لگا —— اس کے چاروں طرف ایک نئی دنیا بکھری ہوئی تھی —— ایک نئی دنیا جس میں روشنی بھی تھی اور وسعت بھی، جو بڑی شاداب اور بڑی خوبصورت تھی۔ اُسے روشن دنیا کے ذرّے بڑے ہمدرد نظر آرہے تھے۔ کیونکہ اُن کے صحت مند چہروں پر مایوسی اور افسردگی نہیں تھی۔ بلکہ مسکراہٹ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی، اور اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کا استقبال کر رہے ہیں۔ اپنی کامیابی سے سرشار وہ روشنی کے چشمے میں تیرتا رہا —— یہاں تک کہ تھک گیا —— اچانک ایک دم تاریکی چھا گئی۔

اس نے حیران ہوکر ایک ذرے سے پوچھا

"روشنی کہاں گئی؟"

نئے ذرّے نے جواب دیا

"اب شام ہوگئی ہے، کمرے کے باہر وسیع دنیا میں روشنی کا منبع یعنی سورج اپنی کرنیں سمیٹ کر جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چاند اور ستارے نکلیں گے —— تھوڑی سی روشنی اندر آجائے گی —— آہ خوبصورت اور پیاری روشنی تو باہر ہے —— باہر کی وسیع دنیا میں۔"

"میں اسی وسیع دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔" چھوٹا ذرہ بولا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"آگے ہوا کے بڑے تیز و تند تھپیڑے ہیں جو ہمیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں باہر جانا ممکن نہیں۔"

———— مگر وہ دیکھو باہر جانے کا راستہ تو ہے ————

دروازے میں ———" وہ بولا۔

"راستہ ہے تو لیکن باہر نکلنا بہت مشکل ہے۔ وہاں ہوا بہت تیز ہے"

"کوئی پروا نہیں ——— میں باہر جاؤں گا ———— میں باہر کی سنہری اور روشن دنیا میں ضرور جاؤں ——— ضرور جاؤں گا"

اور یہ کہتے ہوئے وہ پھر پرواز کرنے لگا، اوپر ہی اوپر ——— بلند سے بلند تر فضا میں! ٭

ایک مصنّف

جب سے مصنّف نے بمبئی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اس کے دوستوں اور عقیدتمندوں کے خطوط کا سلسلہ ختم ہونے میں آتا ہی نہیں تھا۔ ہر ڈاک سے کم از کم دو تین خط ضرور موصول ہو جاتے تھے۔ وہ ہر خط کو ایک خاص عالمِ مسرت میں پڑھتا تھا، اور پھر لفافے میں بند کر کے حفاظت کے ساتھ الماری میں رکھ دیتا تھا۔ دوستوں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ اسے ایک قسم کا "قلمی تعارف" حاصل تھا وہ بھی اس کے انتظار میں اپنی آنکھیں فرشِ راہ کئے بیٹھے تھے۔ اور اسے اپنا مہمان بنانے میں فخر محسوس کر رہے تھے۔ اسے ان ہستیوں کے خط بھی ملے تھے جن کے نام اس نے پہلے کبھی نہیں سُنے تھے اگرچہ اس کی ذہنی کاوشوں کے دل و جان سے قدر دان تھے۔

قدر و منزلت کا ایک شدید احساس مُصنّف کی رگ رگ میں لہرا رہا تھا، اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ عام انسانوں کی سطح سے۔ یقیناً بلند ہے، ایک بلند پایہ مصنّف ہے اور دنیا میں ہر ذلیل شخص مصنف نہیں بن سکتا۔

پندرہ دن کے بعد اس نے الماری کا دروازہ کھولا۔ تمام خطوط نکالے، اور ایک شدید احساسِ عظمت کے ساتھ انہیں میز پر پھینک کر خود آرام کرسی میں لیٹ گیا۔ بے خودی کے عالم میں وہ دماغ کے ان مقفّل دروازوں کو کھولنے لگا جن کے پیچھے احساسِ کمتری کی اندھیری کوٹھڑی میں مدت سے اس کے ولولوں کی دنیا سِسک سِسک کر دم توڑ رہی تھی۔ ان ولولوں میں یک بیک جان سی پڑ گئی، جیسے بہار آتے ہی سوکھے پودوں میں شگفتگی کی روح چھا جائے، یا جیسے سوکھی ندی میں یکایک کہیں سے پانی آجائے۔ اس کی امنگوں کی قوسِ قزح مایوسی کے زہریلے دھوئیں

میں سے ابھرنے لگی۔ اور اس کے افقِ حیات پر مدہوش کن رنگینیاں چھاگئیں۔ اس کے سامنے میز پر خطوط کا انبار پڑا تھا۔ ان خطوط میں چمکتے ہوئے سفید رنگ کے لفافے بھی تھے، اور ہلکے گلابی رنگ کے نفیس خط بھی، اور دو چار ایسے بھی تھے جن کی پیشانی پر ملک کی مشہور کاروباری فرموں اور فلم کمپنیوں کے نام اور پتے درج تھے۔ وہ سوچنے لگا ان خطوط کی موجودگی میں یہ خیال کرنا کہ مصنف کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، ایک خوفناک غلط فہمی ہے۔ اس کے بلند پرواز افکار و تصورات نے ایک دنیا کو مسحور کر رکھا ہے۔ بے شمار لوگ اس کے مداح ہیں اور انتہائی بے صبری سے اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ یہ خیال کر کے خاص طور پر خوش تھا کہ اب اس کی ذہنی غلامی کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اور دو چار روز کے بعد وہ آزادی کے ساتھ آزاد فضا میں سانس لے کر اپنی نئی زندگی شروع کریگا۔ اس کی نگاہ کے سامنے نئی زندگی کا نقشہ گھومنے لگا۔ بمبئی میں مستقل قیام، کسی فلم کمپنی سے باوقار وابستگی یا کسی تجارتی ادارے میں با اختیار عہدہ، اور پھر لکھنے پڑھنے کے لیے کافی فرصت ان کے علاوہ اسے اور کیا چاہیے تھا؟

گزشتہ چار سال سے وہ دفتر کے ادب کُش ماحول میں کولھو کا بیل بنا ہُوا تھا، اُس کی محدود دنیا گھر سے شروع ہو کر دفتر کی دیواروں سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ مسلسل چار سال سے وہ اس قسم کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ رات دن بڑے بڑے فائلوں پر جھکنے کے باوجود مہینے کے آغاز میں اس کے پاس اتنی رقم بھی نہیں ہوتی تھی کہ زندگی کی بنیادی ضرورتیں ہی پوری کر سکے۔ دفتر میں کئی گھنٹے گزارنے کے بعد جب وہ گھر آتا تھا تو اس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ زندگی کے متعلق کچھ سوچ سکے، اور اپنے ذہنی تجربات کو سپردِ قلم کر سکے۔ پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہتا تھا۔ کبھی کوئی مضمون، کبھی کوئی ڈراما اور کبھی کوئی افسانہ۔ وہ اکثر سوچتا اگر اسے غور و فکر کا پورا موقع ملے تو وہ اپنے افکار و تصورات سے دُنیائے ادب میں ایک انقلاب لا سکتا ہے۔ ادب کی مختلف اصناف کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہے ——— کوئی چیز بھی آج تک اس نے اطمینان کے ساتھ نہیں لکھی تھی، اسے آج تک اطمینان نصیب ہی نہیں ہوا تھا۔ اب تک اس نے جو کچھ لکھا تھا ایک حد تک پریشانی ہی کے عالم میں لکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ادبی افکار سے مطمئن نہیں تھا۔ اس قسم کے خیال اکثر اس کے دماغ میں آتے تھے، اور پھر اس طرح چلے جاتے تھے جس طرح

کبھی کبھی اندھیرے غار میں ہوا کا جھونکا آئے اور پھر جلد ہی نکل آئے۔

وہ خطوں کو سمیٹ کر فائل میں رکھنے گیا، کہ اس کی بیوی بچی کو گود میں اُٹھائے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ یہ عورت بڑے صبر و استقلال سے اس کی غریبانہ زندگی کا ساتھ دے رہی تھی، اس کے ہونٹوں پر، اس کی آنکھوں میں ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ اس نے اپنی رفیقۂ حیات کو کوئی آرام، کوئی سہولت نہیں پہنچائی تھی، اور وہ اسی خیال سے اکثر اپنے دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔

اپنی بیوی کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں جذبات کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے کہنا چاہتا تھا، آج سے کلرکی کی لعنت ختم، ہم بمبئی میں رہیں گے، شاندار فلیٹ معقول مشاہرہ، اچھی غذا، اور اچھا لباس اور کتابوں کے مطالعے کے لیے تسکین بخش فراغت۔ شوہر کے ہاتھوں میں خطوں کا انبار دیکھ کر وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کا شوہر تصور میں ایک نئی دنیا آباد کر چکا ہے، اپنے شوہر کی ہمت افزائی کے لیے وہ بھی مسکرائی، اور اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ دونوں سفر کے بارے میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔

گاڑی مختلف سٹیشنوں پر رُک رُک کر جا رہی تھی، لوگ اس کے ڈبے میں آتے بھی اور چلے بھی جاتے، مگر وہ اردگرد کے حالات سے بے خبر، اپنے خوشگوار تصورات کے گہوارے میں جھول رہا تھا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہا تھا، ورنہ عام طور پر تھرڈ کلاس میں سفر کرنے کے لیے بھی اس کے پاس معقول پیسے نہیں ہوتے تھے۔ نرم نرم کوچ میں نیم دراز، اس نے اپنی آئندہ زندگی کے کئی پروگرام بنا لیے، کئی تجویزیں سوچ لیں، اور کئی ان کتابوں کے نام تجویز کر لیے، جنھیں اس کو مستقبل قریب میں لکھنا تھا۔

جیسے ہی گاڑی دادر سٹیشن پر رُکی اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے باہر نگاہ ڈالی۔ اس کے دوستوں کا ایک مجمع اس کے ڈبے کی طرف آ رہا تھا۔ آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ گاڑی کے ڈبے ہی سے نہیں بلکہ زندگی کے تاریک اور گمنام گوشے سے بھی نکل کر ایک وسیع میدان میں قدم رکھ رہا ہے ——

گاڑی سے اترتے ہی اسے کئی لوگوں نے گھیرے میں لے لیا۔ ان لوگوں میں ایسے اشخاص بھی

موجود تھے جو اس کے نام کی شہرت سن کر اس کے دوستوں کے ساتھ استقبال کے لیے آ گئے تھے، کے درمیان قدم اٹھاتے ہوئے وہ اپنے سینے کی گہرائیوں میں ایک گدگدی سی محسوس کر رہا تھا، ایک ایسی لذت انگیز گدگدی جس سے اس کا ذہن ہمیشہ محروم رہا تھا۔

بمبئی پہنچنے کو تو وہ پہنچ گیا۔ لیکن اب ایک نیا مسئلہ اس کے سامنے تھا۔ جتنے لوگ اس کے استقبال کے لیے آئے تھے سب کے سب اسے مہمان بنانے پر اصرار کر رہے تھے، اور وہ تھا کہ ہر ایک کے احسان کے نیچے دبا جا رہا تھا، اس نے اپنے ایک پرانے دوست کے یہاں قیام کرنے کی خواہش ظاہر کی، اور اس کا دوست اسے اپنی خوش قسمتی سمجھنے لگا، اس کا یہ دوست چند سال سے بمبئی کی فلم کمپنیوں میں نمایاں حصہ لے رہا تھا اور چند ماہ سے وہ ایک نئی فلم کمپنی کا حصہ دار بھی بن گیا تھا۔

چند دن تو مصنف اس قدر مصروف رہا کہ اپنی بیوی کو خیر و عافیت کا خط بھی نہ لکھ سکا۔ صبح و شام دعوتیں ہو رہی تھیں، مشہور لوگوں سے تعارف کرائے جا رہے تھے اور اس کے اعزاز میں ٹی پارٹیاں ہو رہی تھیں۔

دو تین ادبی مجلسوں میں اس کے ادب سے متعلق تقریریں بھی ہو چکی تھیں۔ اس کی دو کتابوں کو ادب کا زندہ جاوید کارنامہ بتایا گیا تھا۔ رات دن اس کے یہاں دوستوں اور عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور جب وہ انتہائی دلچسپ مصروفیات کے بعد پلنگ پر لیٹتا تو دن بھر جو کچھ ہوا تھا اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا، مگر ابھی تک بمبئی کے اخباروں میں اس کے متعلق خبریں شائع ہو رہی تھیں، آج فلاں ہوٹل میں فلاں صاحب نے مصنف کے اعزاز میں پارٹی دی، اور آج فلاں فلم ڈائریکٹر نے اسے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا، یعنی پندرہ دنوں میں وہ اپنے متعلق کچھ بھی نہ سوچ سکا، آج اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور کاغذ کا ایک ٹکڑہ باہر نکالا تو معاً اسے یاد آیا کہ وہ دفتر سے ایک ماہ کی چھٹی لے کر آیا ہے، اور یہ اس کی چھٹی کی درخواست کی نقل تھی، نفرت و حقارت کے ساتھ اس نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو پھاڑ ڈالا، اور اسی وقت استعفیٰ لکھ کر جیب میں ڈال لیا۔ وہ

وہیں سے استعفیٰ بھیج دینا چاہتا تھا۔

پانچ دن اور گذر گئے، اس کا میزبان اپنی کمپنی سے متعلق کسی کام کی غرض سے پونا جا چکا تھا اور اب پہلے کی طرح اس کے پاس لوگوں کا ہجوم بھی نہیں رہتا تھا، اس لیے اُسے اپنے بارے میں سوچنے کا موقع مل گیا۔ اس کے میزبان کو اپنی کمپنی کے لیے ایک نئے پبلسٹی آفیسر کی ضرورت ہے، ظاہر ہے کہ یہ کام اس کے حسب منشا ہے، اور اس کا میزبان اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کی طرف کیوں توجہ کرنے لگا۔ اس کے لیے اپنی کمپنی میں گنجائش نکالنا کمپنی کے لیے ایک فخر انگیز امر ہے۔ مسٹر رضوی اس کی خدمات سے فائدہ اٹھانا اپنی خوش قسمتی نہیں سمجھیں گے؟

رضوی صاحب چند روز سے اس کے حلقۂ احباب میں شامل ہوئے تھے۔ پہلی ملاقات ہی میں انھوں نے مصنف کے کئی طویل افسانوں کے پلاٹ سنا دیئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ ان کی ایک کتاب کو کم از کم چھ مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔ انصاری صاحب ایک بہت بڑے ادارے کے روح رواں ہیں۔ انھیں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو دن میں کسی وقت ان کے انگریزی اشتہارات کو اُردو میں منتقل کر دیا کرے۔ مصنف سے بہتر آدمی انھیں اور کون مل سکتا ہے؟

اس نے کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا، سڑک پر رنگ برنگ خوبصورت گاڑیاں بڑی تیزی کے ساتھ ایک دوسری کے پیچھے بھاگی جا رہی ہیں، ہر چیز خوبصورت تھی، ہر چیز اسے مانوس سی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے وہ سالہا سال سے اس شہر میں زندگی بسر کر رہا ہے، اور ان خوبصورت چیزوں کو روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہتا ہے۔

دس دن اور گزر گئے، ملاقاتیوں کی تعداد میں فرق ضرور پڑا، مگر جو بھی آتا تھا محبت اور عقیدت کے ساتھ آتا تھا، اور گھنٹوں اس کی ادبی تخلیقات کے بارے میں گفتگو کرتا رہتا تھا۔

گیارھویں دن اس کا میزبان پونا سے واپس آ گیا۔ آتے ہی اس نے شرمندگی کے ساتھ معذرت طلب کی کہ وہ اسے چھوڑ کر پونا چلا گیا۔ کتنی گہری اور شدید محبت تھی اس کے میزبان کو اس کے ساتھ۔ رسمی باتوں کے بعد اس کا میزبان اسے بتاتا رہا کہ پونا میں اس نے کیا کام کیا ہے۔ مصنف اس کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سُن رہا تھا۔ وہ یہ سننا چاہتا تھا کہ کمپنی کے لیے ایک پبلسٹی آفیسر کی ضرورت ہے، اس کے لیے کیا کیا گیا ہے۔ اس کے میزبان نے سب

کچھ بتا دیا مگر اس معاملے کے متعلق کچھ نہ کہا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے خود ہی پوچھا۔

"ہاں تو وہ آپ کی کمپنی کے لیے پبلسٹی ......"

اس سے پیشتر کہ مصنف فقرہ مکمل کرے۔ اس کا میزبان بول اٹھا، ایک صاحب نظروں میں ہیں، آپ کے بڑے مداح ہیں، کہتے ہیں آپ کی کتابیں پڑھ کر انھوں نے انشا پردازی سیکھی ہے۔ کل پرسوں آئیں گے ضرور" اور یہ کہہ کر وہ نوکروں کو ہدایت دینے لگے کہ مہمان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

مصنف کے دل میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ایک تیز رو اس کے ذہن میں ٹکرا رہی تھی، وہ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن الفاظ حلق میں آکر رک گئے۔ اب میزبان صاحب پردے کے پیچھے غائب ہو چکے تھے۔

میزبان کے جانے کے بعد مصنف نے سوچا اس نے اچھا کیا جو مطلب کی بات نہ کی پبلسٹی آفیسر ہونا معمولی بات ہے، یہ بھی کوئی عہدہ ہے، تنخواہ معقول ہے مگر اخباروں کے ایڈیٹروں کی خوشامد بھی تو کرنا پڑتی، اس سے آزادی کب سلامت رہ سکتی ہے" اور یہ سوچتے ہوئے وہ اطمینان کے ساتھ پلنگ پر لیٹ کر نئی سکیمیں سوچنے لگا۔ آج سیواجی پارک میں سے گزرتے ہوئے اس نے ایک خالی فلیٹ دیکھا تھا۔ اس فلیٹ والی بلڈنگ کا مالک اس کا دوست تھا۔ مسعود غزنوی۔ فلیٹ دیکھتے ہی اس نے ارادہ کر لیا، کہ وہ یہیں رہے گا۔

دوسرے دن رضوی صاحب نے اسے چائے پر مدعو کیا۔ بمبئی میں یہ پہلا موقع تھا کہ شہر کے قریب قریب سارے مشہور اہل قلم یکجا ہو گئے تھے، ان میں گجراتی ادیب بھی تھے، اور مرہٹی بھی، ہندی قلم کار بھی، اور انگریزی زبان کے انشاء پرداز بھی۔ رضوی صاحب نے مصنف کو سب لوگوں سے ملایا اور اس کی اتنی تعریف کی کہ وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

جب مہمان چلے گئے، اور کمرے میں رضوی صاحب اور مصنف کے سوا اور کوئی بھی باقی نہ رہا تو مصنف نے باتوں ہی باتوں میں کلرکی کی زندگی کے خوفناک، بھیانک اور ادب کش پہلوؤں کو اس انداز سے پیش کیا کہ اس کا مخاطب کانپ اٹھا، اور جب اس نے بیان

کیا کہ اس نے کلرکی کے یہ چار سال کس قدر غیر شاعرانہ فضا میں گزارے ہیں۔ تو رضوی صاحب کا یہ حال تھا کہ جیسے وہ ابھی فرطِ محبت و ہمدردی سے اسے سینے کے ساتھ لگائے گا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا، آپ جیسے بلند پایہ مصنف کو ہندوستان میں پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر آپ یورپ میں پیدا ہوتے۔ تو۔ تو۔ تو۔ ․․․․․․" رضوی صاحب کو شدّتِ احساس میں الفاظ نہ ملے اور وہ فقرہ غیر مکمل چھوڑ کر کہنے لگے۔ "میں آپ کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا ہوں، اتوار کے روز آئیے، اکٹھے کھانا کھائیں گے اور کچھ خاص باتیں بھی کریں گے!"

وہ رضوی صاحب کے بنگلے سے نکلا تو اسے اپنے چاروں طرف روشنی ہی روشنی نظر آئی۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ استعفٰی کا کاغذ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اُسے کلرکی سے اتنی نفرت ہوگئی تھی کہ وہ اس سے متعلق کوئی چیز بھی اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا جب تیس دن پورے ہو جائیں گے تو وہ دفتر کو تار بھیج دے گا۔ اور اس تار میں ملازمت سے علیحدگی کا ذکر کر دے گا۔ نفرت و حقارت کے ساتھ اس نے کاغذ کے کئی ٹکڑے کئے اور انہیں ہوا میں اُڑا دیا۔

رات کو جب وہ بستر پر لیٹا تو رضوی صاحب کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے "اتوار کو ضرور آئیے چند خاص باتیں کرنی ہیں" یہ چند خاص باتیں کیا ہو سکتی ہیں، یہی کہ آپ میرے ادارے میں آجائیں ــــ اور ــــ"

اس رات اس نے بڑا خوشگوار خواب دیکھا۔

اتوار کو وقت مقررہ پر رضوی صاحب کے بنگلے پر پہنچا۔ وہ بنگلے سے باہر باغیچے میں ان کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ بڑے تکلف سے ملے۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ادب سے متعلق گفتگو شروع ہوگئی۔ رضوی صاحب بڑے شوق سے مصنف کی باتیں سُن رہے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ ان کی زندگی کے حالات بھی پوچھتے جاتے تھے رضوی صاحب دراصل مصنف کے حالاتِ زندگی لکھنا چاہتے تھے، یہ ان کی بڑی پرانی خواہش تھی۔ اور اب مصنف خود ان کے سامنے بیٹھا تھا، اور وہ اپنے مضمون کے لیے

مواد اکٹھا کر رہے تھے

رات کے گیارہ بجے تک باتیں ہوتی رہیں، مصنّف کو یہ خیال ہی نہ رہا کہ ابھی رضوی صاحب کو خاص باتیں کرنا ہیں، اور اسے خاص طور پر اسی مقصد کے لیے بلایا گیا ہے۔ جب گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے کوئی نیا موضوع نہ رہا تو یک لخت مصنّف کے ذہن میں ایک کانٹا سا چبھنے لگا۔

ہاں تو وہ خاص باتیں ——— آپ نے کچھ اشارہ کیا تھا اس دن ——— میرا مطلب ہے ٹی پارٹی کے دن ———"

یہ الفاظ کہتے ہوئے مصنف کی رگوں میں خون کی گردش رک سی گئی ——— وہ سانس روک کر، پان دانتوں تلے دبا کر، رضوی صاحب کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں انگشتری کو دیکھنے لگا جس میں سرخ رنگ کا ہیرا چمک رہا تھا۔

رضوی صاحب مسکرائے "میں آپ کے بارے میں ایک مقالہ لکھنا چاہتا تھا ——— بڑی پرانی آرزو تھی میری۔ یہ مقالہ پڑھ کر قدر ناشناس ہندوستانیوں کو معلوم ہوگا کہ ان کے جلیل القدر مصنف نے کس طرح فاقے کر کر کے ادب میں لازوال اضافہ کیا۔ خدا کی قسم ہندوستان جیسا مردہ ملک ساری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

مصنّف کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر آواز اس کے گلے میں آکر رک گئی تھی۔ وہ ابھی رضوی صاحب کی انگلیوں کو دیکھ رہا تھا جو سگریٹ کی راکھ جھاڑ رہی تھیں۔

"میں آپ کا بڑا شکر گزار ہوں، شاید نیند آرہی ہے۔"

رضوی صاحب نے مصنّف کی خاموشی سے یہی اندازہ لگایا تھا۔ مصنّف اُٹھا اور چند لمحوں میں وہ بنگلے کے باہر کھڑا آخری بس کا انتظار کر رہا تھا۔ موٹریں بھاگی جا رہی تھیں۔ بلند عمارتوں کی کھڑکیوں میں ہوا کے جھونکوں سے ریشمی پردے لہرا رہے تھے، دور سمندر کے سینے پر چھوٹی بڑی کشتیاں بہے جا رہی تھیں۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ یہ سب چیزیں سپنے میں دیکھ رہا ہے، وہ ایک اجنبی شہر میں کھڑا ہے جہاں ہر شے سے اجنبیت ٹپک رہی ہے۔

تین دن اور گزر گئے۔ اس نے سنا کہ انصاری صاحب نے اپنی فرم کے لیے ایک اخبار کے سابق نامہ نگار کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ اور مسٹر کمار نے فلمی افسانہ لکھنے کے فرائض تھیٹر کے ایک پرانے ایکٹر کے سپرد کر دیئے ہیں۔

چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اس نے دفتر کو تار لکھا کہ وہ بہت جلد آ رہا ہے، اور سوٹ کیس کھول کر نقدی کا حساب لگانے لگا۔ وہاں صرف اتنی رقم موجود تھی کہ وہ تیسرے درجے میں بیٹھ کر اپنے شہر پہنچ سکے۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس کے میزبان نے بڑے اخلاص کے ساتھ کہا۔

"میری آرزو تھی کہ آپ ہمیشہ میرے مہمان رہیں، مگر بھابی اداس ہوں گی۔ مجھے فخر ہے کہ ملک کا اتنا بڑا مصنف چند دن غریب خانے پر ٹھہرا۔ اچھا خدا حافظ۔"

مائی پھاتاں

اُس دن سارا شہر شیخ خیرالدین مرحوم کا پہلا جنم دن منا رہا تھا!

یہ دن منانے کے لیے کئی ہفتوں سے بڑی شدومد کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ اخبارات کے خاص نمبر شائع ہو رہے تھے۔ رسائل و جرائد میں مرحوم کی تصاویر چھاپی جا رہی تھیں اور اتوار کی شام کو کارپوریشن کے میئر کی زیرِ صدارت ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام بھی ہو رہا تھا اس جلسے میں شہر کی کئی ممتاز و مشہور ہستیاں مرحوم و مغفور کی زندگی کے واقعات پر روشنی ڈال رہی تھیں اور مجھے بھی اسی سلسلے میں مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے مرحوم سے ذاتی واقفیت تھی۔ اِس کے علاوہ اخباروں، رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کے مطالعے کے بعد میرے پاس اتنا مواد جمع ہو گیا تھا کہ اُن کے بارے میں ایک تقریر کیا کم سے کم دس لمبی چوڑی تقریریں بھی تیار کر سکتا تھا۔ مگر میں چاہتا تھا کہ جو کچھ لکھوں وہ مرحوم کی زندگی کے صرف ایک ہی پہلو سے متعلق ہو، اور اس کے لیے میں نے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ تھا شیخ خیرالدین آنجہانی کے احسانات عام لوگوں پر۔ مواد آنکھوں کے سامنے بکھرا پڑا تھا اور میرا قلم بڑی تیزی سے اسے سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ صاحب مرحوم شہر کے مشہور رئیسوں میں تھے۔ آبائی وراثت میں آپ کو کافی جائداد ملی تھی۔ اس کے علاوہ اپنی ذاتی کوششوں سے بھی آپ نے دولت میں کافی اضافہ کر لیا تھا۔ مگر دیکھنے والی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی دولت

کو کہاں کہاں خرچ کیا اور مرحوم کے نزدیک اپنے سرمائے کا حقیقی مصرف کیا تھا۔ شیخ صاحب بے نواؤں کا آسرا اور یتیموں کا ملجا تھے۔ ساری عمر خلقِ خدا کی خدمت کرتے رہے۔ آپ نے اپنی آمدنی کا ایک خاص حصّہ لوگوں کی بہتری کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ استاد ذوقؔ کا ایک شعر ہے ؎

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

اور مرحوم اس شعر کی زندہ مثال تھے۔ آج خیر الدین ہسپتال کا نام کون نہیں جانتا؟ اس ہسپتال میں روزانہ بیسیوں مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور اکثر مریضوں کو دوا مفت دی جاتی ہے۔ مرحوم نے صرف ہسپتال ہی نہیں اپنی جیبِ خاص سے ایک معقول رقم صرف کر کے ایک یتیم خانہ بھی تعمیر کروا دیا تھا۔ اور آج بھی اس یتیم خانے میں قوم کے کئی بے نوا اور بے آسرا بچے پرورش پا رہے ہیں۔ بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا۔

"باؤجی! ایک خط لکھ دو گے؟"

میرا قلم چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ سر اُٹھا کر سامنے دیکھتا ہوں۔ مہراں گوالن اپنے میلے ہاتھوں میں خالی لفافہ پکڑے دہلیز پر کھڑی ہے۔

"خط لکھ دو نا۔ پھرست نہیں ہے؟"

جانتا ہوں کہ اگر اس وقت تمام حالات کو سمیٹ نہ لیا تو بعد میں عبارت کا ربط و تسلسل ٹوٹ جائے گا اور لکھنے میں وہ آسانی باقی نہیں رہے گی جو اس وقت حاصل ہے۔ مگر کیا کیا جائے انکار کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مہراں گذشتہ دس سال سے بغیر پانی ملائے دودھ مہیا کر رہی ہے اور یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ انکار احسانمندی کے خلاف ہوگا۔ چنانچہ میں سر کے اشارے سے اسے اندر آنے کے لیے کہتا ہوں۔ مہراں اندر آتی ہے اور فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی ہے۔

"باؤجی تکلیف تو ہوگی۔ میری بہن کو لکھنا ہے جو پنڈی میں رہتی ہے۔ تحصیل ——"

"بھئی پہلے بتاؤ لکھنا کیا ہے۔ پتہ بعد میں لکھا جاتا ہے۔ ذرا ٹھہرو۔ کاغذ لے لوں۔ ہاں،"

اب بولو ——؟

"بس یہ لکھنا ہے کہ جمعرات کی شام کو مائی پھاتاں مرگئی ہے۔"

"فاطمہ کو مائی پھاتاں کا بڑا خیال رہتا تھا۔ جب فاطمہ کنواری تھی تو ایک دفعہ اس کا پاؤں ذرا جل گیا تھا۔ پھاتاں سارا دن گھومتی رہی اور اللہ جانے کہاں سے مرہم لے کر آئی۔ اس دن اللہ ماری ہڑتال تھی سارے شہر میں۔"

"مائی پھاتاں وہی تھی نا —— دھوبن؟" میں پوچھتا ہوں۔

"گلی کے نکر میں تو رہتی تھی۔ آپ کے کپڑے دھوتی ہوگی سارے محلے کے کپڑے دھوتی تھی وہ تو۔"

"یہی بات ہے پرسوں اس کے گھر کے سامنے چند آدمی بیٹھے تھے۔ تو مائی پھاتاں مر گئی ہے۔"

"کیا کہوں کتنی ہمت والی تھی۔ کام کرکے تھکتی ہی نہیں تھی۔ توبہ عورت تھی کہ لوہے کی مشین۔" مہراں تعریفی لہجے میں کہتی ہے۔

"اور اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ بڑی لڑاکا تھی۔ ہر وقت لڑتی رہتی تھی۔ محلے کے لوگ اس سے پناہ مانگتے تھے۔" میں پھاتاں کی وہ خصوصیت بیان کرتا ہوں جس کا شہرہ عام ہے اور جس کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔

"لڑتی تو ضرور تھی اور شور بھی بہت مچاتی تھی پر اپنے جسم سے لڑتی تھی۔ لوگوں نے اسے اللہ جانے کیوں بدنام کر دیا تھا۔ میں بتاؤں تم کو کیسی عورت تھی وہ —— بڑی اچھی۔ ہائے آپ کا وخت کھراب ہو رہا ہے؟"

میں کاغذ پر نظر ڈالتا ہوں —— "بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا۔" اگلا فقرہ سوچنے کے لیے میں بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر پیشانی رکھ کر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتا ہوں۔

"دنیا میں بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جنھوں نے ٹوٹے ہوئے دل جوڑے ہوں۔ مظلوموں کو سہارا دیا ہو اور جو بے کسوں کا سہارا بنے ہوں۔ شیخ صاحب کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ گرے ہوؤں کے سچے دوست تھے ——" میرے ذہن میں پورا فقرہ الفاظ

کی مناسب ترتیب کے ساتھ آجاتا ہے۔ میں قلم ڈھونڈنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ مہراں ٹکر ٹکر میری طرف دیکھتی ہے۔ نہ جانے کیا سوچ رہی ہے —— کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس کی خاموش نگاہیں ایک التجا لیے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک خاص آرزو کی جھلک ہے۔ جی چاہتا ہے اس کی دو چار باتیں سن لوں، زیادہ سے زیادہ دو چار منٹ صرف ہوں گے۔ اس کے بعد شیخ مرحوم کے دو چار واقعات لکھ کر تقریر مکمل کر دوں گا۔ اور میں کہتا ہوں۔

"تو وہ لڑاکا نہیں تھی —— تمہاری مائی پھاتاں۔"

"ضرور تھی —— میں کہتی ہوں ہاں تھی۔ اللہ بخشے میرے مراد کے میاں کو۔ جب میں اس کے گھر میں آئی بیاہ کر کے تو وہ کہنے لگا۔ دیکھو مہراں! اس پھاتاں سے پرے پرے رہنا کسی دن لڑ پڑی تم سے تو تمہارے سر کا ایک بال بھی نہیں چھوڑے گی۔ میں نے کہا۔ میں بھی کسی سے دبنے والی نہیں ہوں۔ مجھ سے لڑے گی تو منہ کی کھائے گی —— یہ بات تو میں نے کہہ دی پر پھاتاں سے ملتے ہوئے مجھے سچ مچ ڈر لگتا تھا۔ اس نے کئی بار بلانا چاہا مگر میں دور دور ہی رہی۔ ابھی میرے میاں کو مرے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ہو گا کہ پھاتاں کی اپنے خصم مولا بخش سے ایسی لڑائی ہوئی —— ایسی لڑائی ہوئی کہ کیا کہوں۔ پھاتاں نے تو سر پر آسمان اٹھا لیا اس دن میں نے سوچ لیا کہ میں اس سے کبھی نہ ملوں گی۔ پتہ ہے لڑائی کی وجہ کیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ پھاتاں نے کہیں سے سن لیا تھا مولا بخش کا کسی مراثن سے یارانہ ہو گیا ہے اور وہ اس کے گھر میں آتا جاتا رہتا ہے۔ پھاتاں کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی یہ سن کر۔ مراثن کو وہ بے نقط سنائیں کہ توبہ ہی بھلی —— آدھی رات تک اس نے محلے والوں کو سونے نہ دیا —— پر آپ کا وخت کھراب ہو گا میں کہاں پھاتاں کی کہانی لے بیٹھی۔ مہراں بولتے بولتے یک لخت بے چین ہو جاتی ہے۔

"نہیں تم پھاتاں کی لڑائیوں کا حال ضرور سناؤ۔" میں بخوشی کہتا ہوں۔

تیسرے دن پھر لڑائی ہوئی۔ مولا بخش نے کہہ دیا کہ وہ مراثن کے گھر ضرور جایا کرے گا۔ بس پھاتاں تو بھوکی شیرنی بن گئی۔ اس دن اس کا چاچا بھی آگیا اور اس نے غصے میں آ کر مولا بخش کے ہاتھ کی ہڈی توڑ دی۔ شاید دوسرے تیسرے دن کی بات ہے کہ میں کسی گاہک کو دودھ دے

رہی تھی اتنے میں دیکھتی ہوں کہ بھاتاں چھوٹا سا گلاس ہاتھ میں لیے میرے پاس کھڑی ہے۔"

"بہو تھوڑا سا دودھ دے دو" بھاتاں نے کہا

"میں نے اسے دودھ دے دیا۔ خیال تھا دودھ لے کر چلی جائے گی پر وہ تو دھرنا مار کر وہیں بیٹھ گئی اور لگی باتیں سنانے۔ پہلے تو وہ کہنے لگی مولا بخش کو بڑی تکلیف ہے۔ بے چارہ ساری رات تڑپتا رہا ہے۔ اور میں دو راتوں سے بالکل نہیں سوئی۔ پھر وہ اپنے گھر کے حالات بتانے لگی ——— اس دن مجھے پتہ لگا کہ بھاتاں دل کی بری نہیں ——— باؤ جی وہ کیسے بری ہو سکتی تھی اس کا خصم ایک میراثن سے یارانہ کر رہا تھا پر پھر بھی جب وہ گھی ہو جاتا ہے تو وہ ساری ساری رات جاگ کر اس کی خدمت کرتی ہے اور اپنی لولی ساس کی تو وہ اس دن سے خدمت کر رہی ہے جس دن اس کا بیاہ ہوا تھا۔ میرا شک جاتا رہا اور میں اس کے گھر آنے جانے لگی! ——— بیماری میں مولا بخش نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ میراثن کے گھر کبھی نہیں جائے گا، مگر جیسے ہی ٹھیک ہوا بھاتاں کی سونے کی چوڑیاں چرا کر فوراً ادھر بھاگا اور میراثن کو وہ چوڑیاں دے آیا۔

بھاتاں کے رشتہ داروں نے کہا وہ مولا بخش کو چھوڑ دے پر وہ اس بات پر راجی نہ ہوئی۔ میکے چلی گئی اور ایک مہینے کے بعد پھر آ گئی۔ اللہ جانے اسے کیوں اپنے ایسے برے خصم کا خیال رہتا تھا۔ میں ہوتی اس کی جگہ تو پتہ ہے کیا کرتی کبھی ادھر نہ جاتی سچ کہتی ہوں۔ اچھا تو ایک دن کا ذکر ہے میں کوٹھڑی میں بیٹھی روٹی کھا رہی تھی کہ ایک عورت آئی۔ کوئلے کی طرح کالا رنگ، قندھاری انار کی طرح سرخ آنکھیں اور گلے میں موتیوں کی مالا۔ میں نے کہا یا الٰہی یہ کون ہے اور کیوں یہاں آئی ہے وہ عورت کولھے مٹکاتی ہوئی آئی اور میرے پاس مونڈھے پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا "بہن تو کدھر سے آئی ہے اور کیا کام ہے" اس پر وہ بولی "میرا نام ذاراں ہے مصری شاہ میں رہتی ہوں۔ ذرا مولا بخش کو بلا دو"

میں بولی "ہائے تو تو وہی مراثن ہے نا ——— نہ بابا! میں تو اس کام میں نہیں آؤں گی۔ بھاتاں نے سن لیا کہ تو یہاں ہے تو اللہ جانے کیا کرے۔ بڑی سخت عورت ہے۔ سارا محلہ اس سے ڈرتا ہے"

یہ سن کر وہ بولی "بہن! اب میں کہاں جاؤں، گھر والوں نے مجھے نکال دیا ہے کہتے ہیں

تو "داگدار" ہوگئی ہے۔ مولا بخش کو ذرا بلاؤنا اس سے پوچھوں اب داگدار کر کے مجھے کس کے حوالے کرتا ہے بدماش کہیں کا۔"

میں نے کہا "یہ تو میں نہیں جانتی کہ اب تم کہاں جاؤ۔ پر میں اس کام میں نہیں آؤں گی کبھی تو نے پھاتاں کو دیکھا نہیں۔ اس نے اگر تجھے دیکھ لیا یہاں تو تیری ہڈیاں تک پیس ڈالے گی۔ ہاں اللہ جانے بڑی سخت عورت ہے چپ چاپ یہاں سے چلی جا۔ اسی میں تیری کھیر ہے۔"

وہ بولی "میں تو جرور اس سے ملوں گی۔ کئی دن سے وہاں نہیں گیا اللہ اسے کسی کی آئے۔ کیوں آیا تھا میرے گھر۔ اچھا بہن! تو مولا بخش کو نہیں بلاتی تو میں خود اس کے گھر چلی جاتی ہوں۔"

"باؤ جی! وہ تو پھاتاں کے گھر جانے کے لیے تیار تھی پر جب میں نے خوب ڈرایا تو کہنے لگی اچھا پنڈی چلی جاتی ہوں وہاں میرا ماموں رہتا ہے اور وہ باہر چلی گئی ——— گلی میں اندھیرا تھا میں اسے جاتے ہوئے دیکھ نہ سکی۔ سمجھ لیا اب تو اتنا ڈر گئی ہے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھے گی۔"

صبح سویرے میں پھاتاں کے گھر گئی تو جو کچھ میں نے دیکھا وہ بڑا ہی نرالا تھا۔ پھاتاں کپڑوں پر استری کر رہی تھی اور وہ ——— بھلا کون ——— وہ مراثن پھاتاں کی سوکن ——— مونڈھے پر بیٹھی دہی کے ساتھ رات کی بچی ہوئی روٹی کھا رہی تھی۔ میں حیران رہ گئی۔ پھاتاں کہنے لگی "مہراں جانتی ہو یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "نہیں ——— جھوٹ موٹ کہہ دیا نا۔"

کہنے لگی "یہ وہی نوچی ہے داراں مراثن۔"

"تو یہ یہاں؟"

"ہاں بہو کہتی ہے مجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے۔ میرا اب کوئی نہیں اور میں داگدار ہو گئی ہوں۔ میں نے کہا اچھا تجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے تو آجا یہاں اللہ جو ہمیں روکھی سوکھی دیتا ہے تو بھی کھا لیا کر۔" اور داراں پھاتاں کے گھر میں رہنے لگی۔

پھاتاں کے رشتہ داروں کو جب پتہ لگا کہ داراں مراثن اس کے گھر آگئی ہے تو ایسا ہوا جیسے بھڑوں کے چھتے کو کسی نے چھیڑ دیا ہو۔ سب نے کہا اسے فوراً گھر سے نکال دو۔ مگر پھاتاں بولی میں اسے سہارا دے چکی ہوں اب تو اسے نہیں نکالوں گی۔ کہاں کہاں ماری پھرے گی یہاں سے جا کر ———

—— باؤجی! کیا کہوں پھاتاں کے رشتہ داروں نے بہت سختی کی۔ پھاتاں کے چچا نے تو یہاں تک کہہ دیا اگر یہ مراثن یہاں رہے گی تو کبھی تمہارے گھر نہیں آئیں گا۔ پھاتاں نے سب کچھ سنا پر اس اللہ کی بندی نے داراں کو گھر سے جانے کے لیے نہ کہا۔

پھاتاں پہلے کی طرح ہی گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ داراں زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی —— اس کا پیشہ گانا بجانا تھا۔ وہ استری کر سکتی تھی۔ بھٹی جھونک سکتی تھی بھلا؟ —— اچھا تو دن گزرتے گئے پھاتاں کے سب ملنے والوں نے اس کا "بیائی کاٹ" کر دیا۔ باپ نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر داراں کہنے لگی "بہن! بس اب زیادہ نہیں —— میں چلی جاتی ہوں اور وہ جانے لگی۔ پھاتاں نے اس کی چوٹی پکڑ لی اور گھسیٹ کر اسے اندر لے آئی —— اس کے بعد داراں نے جانے کا نام نہ لیا۔

پانچ چھ مہینے کے بعد داراں کے بچی ہوئی۔ بڑی کمزور بچی تھی میں تو اسے دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ بچے گی نہیں پر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ بچی سنبھل گئی اور ماں کی حالت خراب ہو گئی پھاتاں نے اس پر کافی رقم صرف کر دی "لیڈی ڈاکٹار" کو بلایا۔ مگر وہ بچ نہ سکی۔ اس وقت عیشاں —— دو اڑھائی مہینے کی تھی۔

"ماں مر گئی تو بچی کون پالے، داراں نے مرتے وقت بچی پھاتاں کے حوالے کی تھی۔ بس پھاتاں نے اسے چھاتی سے لگا لیا اور اپنی بچی جان کر پالنے لگی، اللہ جانے پھاتاں کو بچی سے کیوں اتنا پیار ہو گیا تھا کہ وہ اُسے گود سے اتارنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی!"

مہراں کو پھر اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس نے میرا کافی وقت ضائع کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس خالی لفافہ کو دیکھنے لگتی ہے جسے وہ ساتھ لائی تھی اور جو اب چارپائی پر میرے کاغذوں کے انبار کے اوپر پڑا تھا۔

"یہ بچی زندہ رہی —— ؟" میں سوال کرتا ہوں۔

مہراں کے گھٹنے پھر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور وہ جلدی سے کہتی ہے۔

"جی ہاں! زندہ رہی پر پھاتاں کے لیے تو ایک مصیبت بن گئی۔ تم پوچھو گے کس طرح —— وہ اس طرح کہ جب تک مراثن زندہ رہی لوگ پھاتاں سے کہتے رہے یہ فاحشاں

عورت ہے اسے فوراً گھر سے نکال دو اور جب وہ مر گئی تو وہ بولے۔ یہ بچی اللہ جانے مولا بخش کی ہے بھی یا نہیں۔ اسے اس کی نانی کے گھر بھجوا دو۔ سنا باؤ جی! مطلب یہ کہ بچی کے بارے میں ان کو شک تھا تو ایک دن پھاتاں کے گھر برادری کے سب لوگ آئے اور کہنے لگے۔ دیکھو پھاتاں ہم اب تک تمہارا منہ دیکھتے رہے ہیں اب کھیر اسی میں ہے کہ اسے اس کی نانی کے گھر بھیج دو، ورنہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا ـــــــ اس وقت پھاتاں نے پتہ ہے کیا کیا وہ سینہ تان کر بولی۔ میں اس معصوم کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔

" اگر تم نہیں چھوڑو گی تو ہم تمہارا " بیائی کاٹ " کر دیں گے۔ انھوں نے کہا۔

" جو دل میں آئے کرو۔ میں تو اسے چھاتی سے لگا چکی ہوں۔ اب موت ہی اسے جُدا کرے گی "۔

مہراں کے لب ولہجہ میں جوش پیدا ہو گیا۔ اور وہ اس طرح بول رہی ہے جیسے سٹیج پر پھاتاں کا کردار ادا کر رہی ہے۔

تو برادری نے پھاتاں کا بائیکاٹ کر دیا ہوگا ؟"

" جی ہاں ـــــــ مولا بخش بھی بیوی کے خلاف ہو گیا۔ پھاتاں کے دونوں لڑکے پہلے ہی مراثن کے بہت خلاف تھے۔ وہ ماموں کے گھر چلے گئے، وہیں کام کاج کرتے ـــــــ ہیں نے جب دیکھا کہ پھاتاں اپنی ضد سے بڑا نسکان ـــــــ کر رہی ہے تو ایک دن اس سے بولی " پھاتاں! اس بچّی کو بھیج ہی دو کیا فیدہ اسے گھر میں رکھنے کا۔ سب لوگ تمہارے خلاف ہو گئے ہیں "۔

یہ سُن کر وہ کہنے لگی

" نہیں بہو! ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کی ماں سے کہا تھا کہ اسے سینے سے لگا کر رکھوں گی کیوں بھیجوں اسے۔ لوگ برخلاف ہو گئے ہیں تو بے شک ہو جائیں۔ جب کسی کو سہارا دیا ہے تو لوگوں سے کیوں ڈریں "۔

میں نے کہا " تمہارے اپنے لڑکے بھی تو برخلاف ہو گئے ہیں "۔

پھاتاں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ سی گئیں۔

لوگ کہتے ہیں لڑکا ماں باپ کا بازو بنتا ہے پر میرے لڑکے تو اللہ کی مار ان پر۔ اچھا جو چاہیں کریں۔ ان سے ڈر نہیں جاؤں گی۔ اللہ ہمت دے سب کام کر لیا کروں گی؟"

اور پھاتاں سب کام کرنے لگی۔ عیشاں بڑی ہونے لگی —— پھاتاں نے رات دن محنت کر کے اس کا جہیز بنایا اپنی پوری پونجی اس پر صرف کر دی۔ جب عیشاں کا بیاہ ہوا تو پھاتاں بڑی خوش تھی کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ باوجود پر اللہ میاں کو یہ بات منظور نہ تھی۔ عیشاں کی شادی گجرات میں ہوئی تھی وہاں کسی نے عیشاں کے سسر کو بتا دیا کہ عیشاں ایک مراثن کی بیٹی ہے۔ بس پھر کیا تھا سسرال والوں نے مار پیٹ کر پھاتاں کے گھر بھجوا دیا اور بعد میں کاغذ بھی بھیج دیا۔ ادھر عیشاں طلاق لے کر گھر آئی اُدھر مولا بخش خون تھوکنے لگا۔ پھاتاں پر دہرا صدمہ پڑا کوئی اور ہوتا تو پاگل ہو جاتا پر پھاتاں نے ہمت نہ ہاری۔ لولی ساس کی خدمت بھی کرتی رہی۔ خصم کی بیماری پر بھی خرچ کیا اور لوگوں کے کپڑے بھی دھوتی رہی۔

تاجی پھاتاں کا رشتے میں بھائی کا بیٹا تھا۔ بڑا آوارہ گرد تھا۔ پھاتاں نے اسے گھر میں رکھ لیا۔ یہ لڑکا کام کاج میں مدد دینے لگا۔ اور جب پھاتاں نے دیکھا کہ تاجی ٹھیک ہو گیا ہے تو اس کی شادی عیشاں سے کر دی خدا خدا کر کے پھاتاں کے سر سے یہ بوجھ بھی اُترا۔ اب سنو مولا بخش دو سال بیمار رہا پھر مر گیا۔ دو چار دن بعد پھاتاں کی لولی ساس بھی چل بسی۔ پھاتاں کی شادی کے بعد پورے تیس اوپر دو برس زندہ رہی تھی یہ پورے تیس اوپر دو برس، اتنے سال پھاتاں نے اس کی خدمت کی تھی۔

ایک رات پھاتاں کپڑوں پر استری کر رہی تھی کہ استری سے اللہ جانے کس طرح کوئلے نکل کر اس کے کپڑوں پر آگرے اور بیچاری کے گھٹنے جل گئے اور سویر تک بے ہوش پڑی رہی۔ صبح عیشاں نے نیچے اتر کر دیکھا تو اپنا سر پیٹ لیا ہم سب نے مل کر اسے چارپائی پر لٹایا اور حکیم کو بلایا اور وہ ہوش میں آگئی، پر اب وہ پہلی سی نہیں رہی تھی۔ چارپائی سے تو اٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔ بے چاری۔ جنگل کی رات کا ذکر ہے پھاتاں نیچے سو رہی تھی اور عیشاں تاجی اور ان کا بچہ اُوپر چھت پر سو رہے تھے۔ آدھی رات کو بچہ رونے لگا، اللہ جانے کیا تکلیف تھی اُسے۔ عیشاں کی جوانی

کی نیند بالکل بے خبر سوتی رہی۔ پھاتاں سے نہ رہا گیا پہلے تو اس نے آوازیں دیں پھر بھی بچہ روتا رہا۔ تو اوپر آ گئی۔ اللہ جانے کس طرح اوپر آ کر اس نے بچہ گود میں اٹھا لیا اور علیشاں کو اٹھا دیا۔ علیشاں بڑی ناراض ہوئی۔

"اماں تیری علاج مرنے کی ہے"

اور یہ بات سچی ہی نکلی۔ پھاتاں کو ہوا لگ گئی اور وہ جمعرات کی شام کو مر گئی ——— ساری عمر لوگوں کی خدمت کرنے کے بعد مر ہی گئی"

مہراں کی آواز بھرا جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں اور وہ دوپٹہ کے پلّو سے ناک پونچھتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔

میں سوچنے لگتا ہوں مائی پھاتاں مر گئی ہے وہ مائی پھاتاں جس نے بتیس سال تک لولی ساس کی خدمت کی، جس نے اس وقت اپنی سوکن کو پناہ دی جس وقت اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ بے آسرا ہو چکی تھی۔ جس نے ایسے وقت میں سوکن کی بچی کو چھاتی سے لگایا جس وقت وہ ماں کے دودھ سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی تھی جس نے دو سال تک بیمار شوہر کی تیمارداری کی ——— جو پچاس سال تک محلّے میں رہی اور جس کے بارے میں چند منٹ پہلے میں صرف یہی جانتا تھا کہ وہ ایک دھوبن ہے اور بڑی لڑاکا ہے"

مہراں آبدیدہ ہو کر میری طرف دیکھتی ہے۔

"تو لکھ دو باؤ جی!"

میں کاغذ نکالتا ہوں اور لکھنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں مہراں آنکھیں بند کر کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے انھیں دباتی ہے اس کی آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈی نم آلود ہو جاتی ہے مہراں انگوٹھے کی ساتھ والی انگلی سے اس نمی کو خشک کرتی ہے اور ایک لمبی آہ بھر کر پوچھتی ہے۔

"لکھ لیا خط"

"ہاں"

"میں خط مکمل کر کے اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ وہ اٹھ بیٹھتی ہے اور جانے

لگتی ہے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رک جاتی ہے۔

"آج شہر میں جھنڈیاں کیوں لگائی جا رہی ہیں؟" مہراں پوچھتی ہے۔

"تمہیں معلوم نہیں۔ آج شیخ خیرالدین مرحوم کا جنم دن منایا جا رہا ہے۔"

"اچھا! شیخ خیرالدین ——— میں نے انہیں دیکھا تھا بہت بڑے آدمی تھے۔ پھاتاں ان کے کپڑے بھی دھویا کرتی تھی۔"

مہراں چلی جاتی ہے۔ میں تقریر مکمل کرنے کے لیے کاغذ پر جھکتا ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا ——— میری آنکھوں کے سامنے پھاتاں کا بوڑھا چہرہ ابھرنے لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس چہرے پر صدیوں کی بے لوث خدمت کا غبار چھایا ہوا ہے اس غبار میں اس کی خاموش نظریں مجھ سے ایک سوال پوچھ رہی ہیں اور میرے ذہن میں مہراں کے الفاظ گونج رہے ہیں ——— "خیردین بہت بڑے آدمی تھے، پھاتاں ان کے کپڑے بھی دھویا کرتی تھی ———"

کمبل

آج بھی سردی اتنی ہی شدید ہے جتنی چار دن پیشتر تھی۔ میرے اوپر چاروں طرف فضا میں زنگار رنگ بادل کبھی بکھر جاتے ہیں اور کبھی اس طرح ایک دوسرے سے لپٹ جاتے جیسے کوئی مفلس آدمی سردی سے بچنے کے لیے اپنے جسم پر چیتھڑوں کو سمیٹ لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہوا میں تندی اور تیزی ہے۔ شاید شام تک باد و باراں کا طوفان آجائے اور پھر گھر تک پہنچنا مشکل ہو جائے۔ ـــــــــــ

میں شام سے پہلے پہلے واپس اپنے مکان پر پہنچ جانا چاہتا ہوں اور اس مقصد کے لیے جلدی جلدی قدم اٹھا رہا ہوں۔ سردی سے محفوظ رہنے کے لیے میں نے چیسٹر پہن رکھا ہے۔ اونی ٹوپی سے سر بھی ڈھکا ہوا ہے اور میری بغل میں ایک کمبل بھی ہے۔ لیکن یہ کمبل میرے اپنے لیے نہیں، چوکیدار غنی کے لیے ہے اور اس وقت میں اسی کے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔

اب میں شہر کی اس سڑک پر پہنچ گیا ہوں جو آبادی کے ہنگامہ زاروں میں سے گزرتی ہوئی بلند اور عالیشان عمارتوں کے پاؤں چھوتی ہوئی دور کہیں جا کر نچلے طبقے کے چند گھروں کے پاس ختم ہو جاتی ہے ـــــــــــ مجھے انہیں گھروں میں سے ایک گھر میں جانا ہے کیونکہ چوکیدار غنی وہیں رہتا ہے۔

ابھی ابھی میں نے ایک ہوٹل میں چائے کی دو گرم پیالیاں پی ہیں۔ پھر بھی سردی کے تصور سے بار بار جھرجھری سی آجاتی ہے۔ مجھے آج کل سردی سے ڈر بھی بہت لگتا ہے۔

اور اس ڈر کے پس منظر میں ایک بڑا تلخ تجربہ ہے اگر یہ تلخ تجربہ میری زندگی میں نہ آتا تو میں سردی سے اس قدر کبھی نہ ڈرتا۔ کبھی یوں بار بار ہوٹل میں چائے نہ پیتا اور کبھی اس طرح بغل میں قیمتی کمبل داب کر ان خراب و خستہ گھروں کی طرف جانے کا ارادہ نہ کرتا جو اس شفاف سڑک کے آخری سرے پر کھڑے ہیں اور جہاں ایک بدنما مکان میں چوکیدار غنی بھی رہتا ہے۔ واقعہ بالکل معمولی تھا، مگر اس کا نتیجہ نہایت اہم ثابت ہوا۔ اتنا اہم کہ میں اسے زندگی کے کسی دور میں بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

خاں صاحب سرفراز خاں رشتے میں میرے ماموں ہوتے ہیں۔ میں سات روز سے ان کے ہاں مہمان ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنے مکان کا نچلا کمرہ دے رکھا ہے اور میں بڑی آزادی کے ساتھ اس کمرے میں مہمانی کے لطف اٹھا رہا ہوں۔ آج سے چار دن پہلے۔ یعنی منگل کی شام کو میں اس توقع کے ساتھ گھر سے نکلا کہ وہ رات اپنے ایک دوست کے ہاں گزار کر صبح ہی صبح لوٹ آؤں گا۔ گھر والوں کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ میری طرف سے بے فکر ہو کر اپنے کسی عزیز کے یہاں شادی میں شریک ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ میں ان کے جانے سے پیشتر ہی دوست کے یہاں پہنچ گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر پکچر دیکھنے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ عرفان کو اپنے والد کی شدید علالت کا تار ملا۔ ایسی حالت میں وہ کس طرح رک سکتا تھا چنانچہ اسی وقت راولپنڈی روانہ ہو گیا اور میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

اس وقت مجھے یہ خیال تک بھی نہ آیا تھا کہ جیسے ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھولوں گا ایک نیا مگر نہایت ناگوار تجربہ مجھے اپنی گرفت میں لے لے گا اور میں ایک ایسی کشمکش میں گرفتار ہو جاؤں گا جس کا میں نے کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے طوفان کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ اور سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ ایسے عالم میں نرم اور گرم بستر کا خیال دماغ میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہے ——— ایک ایسی کیفیت جو چائے کی ایک خوبصورت پیالی کو سامنے رکھ کر اس کے نشہ آلود ظہور کو سونگھنے ہی سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ خیال گرد و پیش سے بے نیاز کر دیتا ہے اور میں بھی اس وقت ماحول سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

یہی جی چاہتا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچ جاؤں اور کپڑے اتارے بغیر لحاف میں گھس جاؤں ـــــ مکان کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک آواز آئی "باؤ جی ۔ آ گئے تم "
یہ غنی چوکیدار تھا جس کی شکل سے تو نہیں البتہ گرجدار آواز سے میں ضرور آشنا تھا۔ یہ آواز رات کو کئی کئی بار میرے کمرے کے سامنے " خبردار ہو بھائی " کہتی ہوئی گونجتی تھی اور میں ہر بار پریشان ہو جاتا تھا۔ اسی ناپسندیدگی کا اثر تھا کہ میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ مڑ کر دیکھنے کی بھی کوشش نہ کی۔ خاموشی سے قفل کھولا اور اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جیسے ہی بلب روشن ہوا اور میری نظر پلنگ پر پڑی تو آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے۔ پلنگ کے اوپر ایک چادر اور تکیے کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ معاً یاد آگیا کہ اس دن صبح کو خاں صاحب کی ملازمہ دھوپ دینے کے لیے میرا لحاف وغیرہ اوپر لے گئی تھی اور شادی کی تیاری میں کسی کو ان چیزوں کو نیچے لانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس وقت میری حالت بڑی عجیب تھی۔ سوچتا تھا کہ باہر چلا جاؤں ـــــ مگر کس کے گھر ـــــ رات کے دس بج چکے ہیں کون دروازہ کھولے گا اور پھر اس شہر میں میرے دوست ہیں کتنے۔ اور اگر کمرے ہی میں رہوں تو سردی سے بچنے کی کیا صورت ہوگی ؟"
بادو باراں کا طوفانی خروش مسلسل میرے کانوں سے ٹکرا رہا تھا اور مجھے بار بار جھرجھری آرہی تھی۔ لحاف اوپر سے لا نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ لوگ سب کمروں کو مقفل کر کے گئے تھے۔

سردی بڑھتی جا رہی تھی اور ہوا کی لہریں سوئیوں کی طرح جسم کو چبھنے لگی تھیں۔ کھڑکی کے پٹ بری طرح آپس میں ٹکرا رہے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی اونچے پہاڑ کی برف پوش چوٹی پر پہنچ کر نیچے اترنے کا راستہ بھول گیا ہوں ـــــ اور اب چاروں طرف گھرا اندھیرا پھیلا ہوا ہے کہ نگاہ کو کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی ـــــ تو کیا ساری رات اسی طرح کانپ کانپ کر گزارنا ہوگی ـــــ چیختی، چنگھاڑتی بوجھل ہوا اسی طرح صبح تک میرے بدن کو چھیدتی رہے گی۔ سردی سے محفوظ رہنے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ فرار کی کوئی صورت نہیں سوجھے گی ؟ یہ سوال میرے دماغ میں اس طرح

برپا ہو گئے تھے جیسے آندھی کے تھپیڑے کسی منہدم عمارت کی کمزور دیواروں سے بڑے زور کے ساتھ ٹکرا رہے ہوں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ایک سرد رات میں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ایک گرم رضائی یا کمبل ہے جس کی حرارت آفریں حرارت ایک نیم جاں لرزتے ہوئے جسم کو اپنی گود میں لے کر نیند کی راحتوں سے سرشار کر دیتی ہے۔

اگر میرے دوست کو تار نہ ملتا تو وہ گھر سے چلا نہ جاتا اور اگر اسے تار ملا بھی تھا تو میں اصرار کر کے اس کے کمرے سے باہر نہ نکل آتا اور اگر یہ بھی ہو گیا تھا تو میرے میزبان شادی میں شریک نہ ہوتے۔ یہ دونوں باتیں ہو جاتیں پھر بھی کوئی تکلیف نہ ہوتی بشرطیکہ ملازمہ گھر سے جاتے وقت بستر نیچے لانا نہ بھول جاتی یا کوئی اور ہی شخص اُسے یہ کام کرنے کو کہہ دیتا۔ سارے گھر میں کسی کو بھی یہ بات نہ سوجھی۔ کوئی بھی ادھر توجہ نہ کر سکا ورنہ میں اس وقت پلنگ کے پاس یوں حیران و سراسیمہ کھڑا نہ رہتا۔ لحاف میں گھس کر سو چکا ہوتا اور اس بات کا خیال تک بھی نہ کرتا کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے —— یا سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔

بارش کے ساتھ شاید اولے بھی گرنے لگے تھے۔ گرجتی ہوئی ہواؤں میں تیزی اور تندی بڑھ چکی تھی اور میں سردی کی تاب نہ لا کر بری طرح کانپ رہا تھا —— یکایک کھڑکی کے باہر اندھیرے میں روشنی کا ایک ذرہ ساتھرتھرانے لگا۔ اور پھر آواز آئی۔

"باؤجی! آج گھر میں کوئی نہیں۔ تم بیاہ میں نہیں گئے؟"

میں نے غور سے ادھر دیکھا یہ چوکیدار غنی کی آواز تھی۔ وہ بیڑی پی رہا تھا اور کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔

"تم گھر کی چوکیداری کرو گے باؤجی" اس نے چند لمحے ٹھہر کر پوچھا

"ہاں!"

"اچھا" اور وہ ہنسنے لگا۔ سو جاؤ باؤجی۔ آج تو بڑی سخت سردی ہے۔"

وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ میں نے کہا "یہ لوگ چلے گئے ہیں اور میرا بستر اُوپر چھوڑ گئے ہیں۔"

میں کسی ہمدردانہ جواب کا منتظر تھا مگر وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ "آج تو بڑے پھنسے ہیں نا!"

میری رگ رگ میں کانٹے چبھنے لگے۔ میں غصّے سے کہنے ہی والا تھا دفع ہو جاؤ۔ کہ اس کا چہرہ پیچھے ہٹ گیا اور میرے غم و غصّہ کا شدید طوفان شراروں کی طرح ذہن میں بکھر کر رہ گیا۔ میں نے اُٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ اور دروازے پر جا کھڑا ہوا اسے بلانا چاہا مگر حلق سے آواز نکل ہی نہ سکی۔ یہ خودداری کا جذبہ تھا جو اسے بلانے سے روک رہا تھا۔ سردی کا ڈر اور خودداری کا تقاضا ——— اسی کشمکش میں دروازہ بند کرنا بھی بھول گیا۔ پیچھے ہٹا اور اپنے اردگرد چادر لپیٹ کر پلنگ پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد نیند کے غبار کی ہلکی سی تہ میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔ اور میں غنودگی کے عالم میں سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے یوں محسوس کرنے لگا جیسے برف کے ایک بڑے سے تودے کے اوپر بیٹھا ہوں اور یہ تودا پانی کی ایک وسیع سطح پر بہتا ہوا کسی نہ معلوم منزل کی طرف بڑی تیزی سے چلا جا رہا ہے۔ ساحل کی جھلک دور دور تک بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ ہاں نیلگوں پانی کی بیکراں دنیا کے آخری گوشے میں سرمئی بادلوں کے پیچھے سیاہ نقطوں کا ایک ہجوم سا نظر آ رہا ہے۔ شاید یہی ساحل ہے۔ یہاں آگ ہوگی۔ حرارت ہوگی۔ زندہ رہنے کا سامان ہوگا ——— اچانک وحشی لہروں کے خوفناک تھپیڑے اپنی پوری طاقت سے مجھے ایک طرف دھکیلنے لگتے ہیں اور میں تودے سے گر کر نیچے ہی نیچے پانی کی تاریک گہرائیوں میں جانے لگتا ہوں۔

اور میری آنکھ کھل گئی۔

اپنے آپ کو بری طرح کانپتے دیکھ کر میرے اندر خوف و دہشت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اندھیری رات ساری کائنات کو اپنے طوفانی آغوش میں جکڑے ایک ڈراؤنے ہولناک غار میں اُتر رہی تھی جہاں چاروں طرف برف کی سلیں بکھری پڑی تھیں ——— جہاں موت کے سرد ہاتھ اپنے لمس سے رگوں میں خون منجمد کر رہے تھے اور جہاں دم گھٹا جا رہا تھا۔

بادل گرج رہا تھا اور سردی کی شدت سے ہر عضو میں ایک سخت اذیت محسوس کر رہا تھا۔

میں نے دیوار سے ٹیک لگا دی۔ تکیہ اپنے زانو پر رکھ لیا اور غور و فکر کے لیے کوئی موضوع سوچنے لگا تاکہ اس طرح دماغ مشغول رہے اور رات کسی نہ کسی طرح کٹ جائے۔

سوچنے سے یکسوئی سی حاصل ہوئی اور نیم غنودگی کی سی کیفیت میرے شعور میں رینگنے لگی۔ انہی لمحوں میں مجھے یاد آیا کہ میرے کمرے سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ اور بھی ہے جہاں خاں صاحب کے گھر والوں نے ناقابلِ استعمال پرانی چیزیں پھینک رکھی ہیں۔ ممکن ہے یہاں کوئی پھٹا پرانا کمبل یا لحاف بھی پڑا ہو اور میرے دل میں ایک امید سی جاگ اٹھی۔ معلوم نہیں کب اُٹھا کب اس ملحقہ کمرے کی طرف روانہ ہوا اور کب اس کا دروازہ کھولا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ٹانگوں میں چلنے کی سکت ہی باقی نہیں رہی۔ جیسے سر سے پاؤں تک چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں۔ آنکھوں تلے پتھر کی ایک بڑی سی سِل بڑی تیزی سے گھوم رہی ہے پھر میرے بدن سے ٹکراتی ہے۔ ہر طرف اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ ملحقہ کمرے سے کوئی گرم سی چیز اٹھا لایا ہوں۔ یہ چیز میں نے اپنے جسم پر پھیلا دی ہے۔ زندگی کی حرارت میرے لرزتے ہوئے جسم میں عود کر آئی ہے اور میرے اندر ایک عجیب پُر لطف غنودگی کا احساس جاگ اُٹھا ہے۔ پھیل رہا ہے ـــــ پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

سکوت ـــــ حرارت ـــــ کسی اجنبی ساحل پر الاؤ کی آگ ـــــ میٹھے نغمے ـــــ چڑیوں کے چہچے ـــــ اور پھر ایسی آوازیں جیسے دور کہیں پیالیاں ٹکرا رہی ہیں۔

میری آنکھ کھل گئی۔ خاں صاحب مسکرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے اور میرے جسم پر میرا ہی لحاف پڑا ہوا تھا۔

"بھئی رات کمال کر دیا تم نے۔ واپس کیوں آ گئے تھے دوست کے گھر سے۔ بڑی تکلیف ہوئی ہوگی بستر کے بغیر۔"

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

"اور بھائی یہ میلا کچیلا کمبل کہاں سے اُٹھا لائے تھے؟" خاں صاحب نے سوال کیا۔

"کون سا کمبل؟" میں نے پوچھا۔

"وہی بھائی جو تم نے اوڑھ رکھا تھا۔ ہم نے صبح آ کر اسے پرے پھینک کر تمہارا لحاف تمہارے اوپر ڈال دیا تھا۔"

خاں صاحب کی نگاہیں مسکرا رہی تھیں۔ وہ یقیناً سمجھ چکے ہیں کہ میں رات سردی سے بچنے کے لیے ان کے پرانی چیزوں والے کمرے سے کمبل نکال لایا تھا۔

بات یہیں پر ختم ہو گئی اور میں چائے پینے لگا۔

اس رات کے بعد جو رات آئی وہ بھی سرد تھی۔ مگر میں اپنے گرم اور پھولدار لحاف میں لطف اٹھا رہا تھا۔ اس رات کسی وقت بھی چوکیدار غنی کی آواز نہ گونجی۔ اس کے بعد بھی اس کی آواز نہ آئی۔ اور آج صبح مجھے معلوم ہوا کہ چوکیدار غنی کو نمونیہ ہو گیا ہے اور وہ ڈیوٹی پر نہیں آ رہا۔

آج سے چار دن پہلے اُس طوفانی رات کو مجھے جو تلخ تجربہ ہوا تھا وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں جان گیا ہوں کہ سردی کی شدت کیا ہوتی ہے اور جب سردی اپنا بھرپور وار کرتی ہے تو انسان کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے۔

میں نے چوکیدار غنی کے لیے ایک قیمتی کمبل خرید لیا ہے اور اُسے بغل میں داب کر اس کے گھر کی طرف چلا جا رہا ہوں، میرا دل بہت خوش ہے۔ میں اپنے سامنے چوکیدار غنی کو دیکھ رہا ہوں۔ جو کمبل کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے اور احسانمندانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

اب سڑک ختم ہو گئی ہے۔ وہ سامنے شکستہ مکان کھڑے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ چوکیدار غنی کا مکان پیلے رنگ کا ہے۔ اور وہ ——— اس طرف ایک چھوٹا سا مکان دکھائی دے رہا ہے ——— یہ میری منزلِ مقصود ہے۔ اسی جگہ میں ایک بیمار شخص کے لیے ایک بہت بڑی نعمت لے کر جا رہا ہوں۔

ایک عورت مجھے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں لے جاتی ہے۔ چوکیدار غنی ایک چارپائی

پر لیٹا کھانس رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرانے کی کوشش کرتا ہے اور کھانسی روکنے کے لئے چھاتی پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔

"کیوں باؤجی!"

"بھئی غنی تمہارے لیے یہ کمبل لایا ہوں۔ سنا ہے تمہیں بخار ہو گیا ہے۔"

"ناں باؤجی۔ یہ نہیں۔ مجھے میرا ہی کمبل دو۔"

"تمہارا کمبل؟ —— کونسا؟" میں حیران ہو کر پوچھتا ہوں۔

"باؤجی —— میں ادھر سے گزرا تو دیکھا تم فرش پر گرے پڑے تھے اور کانپ رہے تھے —— میں نے تمہیں اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا اور اپنا کمبل اوڑھا دیا۔ مجھے سردی لگ گئی —— پر کیا ہے، ارمان آ جائے گا!"

وہ زور سے کھانسنے لگتا ہے میں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھ رہا ہوں، —— اور میرا قیمتی کمبل ایک ایسا بوجھ بن گیا ہے جس کے نیچے دب کر رہ گیا ہوں۔

دِینو

اب دوپہر ڈھل چکی تھی اور سورج کی شعاعوں میں جھلس دینے والی کیفیت قدرے کم ہوگئی تھی مگر موچی صدر دین کی واحد رونق دینو گویّے کی شکل دور دور تک بھی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ عام طور پر موسم گرما میں جب آفتاب نصف النہار پر پہنچ جائے تو لاہور کی گلیوں اور کوچوں میں سماجی زندگی کی نبض کافی سُست پڑ جاتی ہے اور یہاں کھلنڈرے لڑکوں کے شور وغل کے سوا اور کوئی ہنگامہ باقی نہیں رہتا۔ ایسے عالم میں چوک دیوی دتا کی چہل پہل بھی ختم ہو جاتی تھی لیکن چوک کے اس حصّے میں جہاں اس کی وسعت چند چھوٹے بڑے مکانوں کی قطاروں میں سمٹ کر ایک گلی کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہاں مہتاب آتش باز کے گھر کے عین سامنے صدر دین کی دکان پر اس وقت بھی رونق میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ اس رونق کا واحد سرچشمہ دینو گویا دکان کے اندر موجود رہتا تھا اور اس کی درد انگیز اور پُرسوز آواز دیر تک سُننے والوں کے دلوں کو متاثر کرتی رہتی تھی ——— مگر اس دن صدر دین کی دکان بھی اس رونق سے خالی تھی۔ کیونکہ دینو ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا اور اس کے سارے ساتھی دکان کے اِردگرد کھڑے ہوئے بڑی بے قراری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

دِینو صرف آنکھوں ہی سے معذور نہیں تھا بائیں ہاتھ سے بھی محروم تھا۔ اس کا بایاں بازو بالکل ٹھیک تھا۔ بانہہ بھی درست حالت میں تھی۔ مگر بانہہ کے آخر میں جہاں ہاتھ ہونا چاہیے اس جگہ گوشت ہڈی کے اوپر پھیل کر ایک لوتھڑا سا بن گیا تھا۔

دینو اپنی عادت کی وجہ سے یا دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اپنا عیب چھپانے کے لیے دن کے وقت اسے ایک میلے رومال سے چھپائے رکھتا تھا اور جن لوگوں کو اصل حقیقت معلوم نہیں تھی وہ یہی سمجھتے تھے کہ دینو نے ہاتھ کے زخم پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے ـــــــ مگر جس وقت وہ صدر دین کی دکان کے اندر بیٹھ کر یہی لنجی بانھ گھڑے کے منہ پہ ڈال کر اور دوسرے ہاتھ سے گھڑا بجا بجا کر سیف الملوک یا یوسف زلیخا کے شعر گاتا تھا تو سننے والے ایک بار تو ضرور ہی جھوم جھوم اٹھتے تھے۔ اسے سیف الملوک کے سارے کے سارے شعر زبانی یاد تھے۔ اور یوسف زلیخا کے بھی بے شمار اشعار حافظے میں محفوظ تھے۔ وہ عموماً وہی شعر شوق سے سناتا تھا جن میں دردِ ہجر، دُکھ اور غم کے جذبات بیان کیے گئے ہیں۔ وہ کسی کی فرمائش پر نہیں گاتا تھا اور کبھی کسی نے گانے کی فرمائش اس سے کی بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے شوق سے گاتا تھا اور گھنٹوں گاتا رہتا تھا۔ شاید آنکھوں اور ہاتھ سے معذور ہو جانے کی وجہ سے اس کے اندر محرومی کا جو شدید احساس پیدا ہو گیا تھا وہ اسی شغل میں دب کر رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ روزانہ ہر موسم اور ہر حالت میں اپنے گھر سے چل کر صدر دین کی دکان پر ضرور پہنچ جاتا تھا۔ اور جب تک شام کا اندھیرا پھیل نہیں جاتا تھا دکان سے باہر قدم نہیں رکھتا تھا۔

ہر روز دکان کے سامنے پہنچ کر جیسے ہی وہ اپنی لاٹھی زور سے زمین پر مار کر بلند آواز میں اَسلاماں لیکم کہتا چاروں طرف ایک کھلبلی سی مچ جاتی ـــــــ مایا رام اپنی کھڑکی میں سے اسے دیکھ کر جلدی سے نیچے اتر آتا ـــــــ مہتاب آتش باز اپنا کام چھوڑ کر اپنے سامان والی کوٹھڑی کو تالا لگانے لگتا ـــــــ اور حسّو دھوبی بھی اس کے آنے کی خبر سن کر گرم استری اپنی بڑبڑاتی ہوئی بیوی کے حوالے کر کے یاروں کی محفل میں آپہنچتا ـــــــ یہ تینوں آدمی تو وہ تھے جو ہر روز دینو کی شکل دیکھتے ہی صدر دین کی دکان پر جا بیٹھتے تھے اور جب تک کوئی ضروری کام نہ آپڑتا یا گھر والے سخت اصرار کر کے پریشان نہ کر دیتے، وہاں سے اٹھنے کا نام نہ لیتے ـــــــ ان کے علاوہ اس محفل کے دو اور مستقل رکن بھی تھے جو دکان پر پہنچنے میں شاذ و نادر ہی ناغہ کرتے تھے۔ ان میں سے ایک تو علماں بزاز تھا اور دوسرا کاکا چڑیمار۔ علماں بزاز شہر میں اپنے حلقے کی پھیری لگا کر عموماً تین چار بجے گھر لوٹتا تھا اور اسی

وقت دکان پر پہنچ جاتا تھا۔ کاکا چڑیمار کو چڑیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ لڑکپن کے زمانہ میں وہ گھنٹوں چڑیوں کے پیچھے بھاگا پھرتا تھا اور اسی وجہ سے چڑیمار مشہور ہوگیا تھا۔ اب تو وہ صبح صبح ڈوری کانٹے لے کر دریا کی طرف نکل جاتا تھا اور دوپہر تک جتنی مچھلیاں پکڑ لیتا تھا انھیں مچھلی منڈی یا کہیں اور بیچ کر دو تین بجے گھر آجاتا تھا۔ اور پھر دن بھر کی تھکاوٹ بھی اسے صدردین کی دوکان میں جانے سے نہیں روک سکتی تھی۔ دینو ان سب کو یاروں کی محفل کہا کرتا تھا اور وہ خود اس محفل کی روح و رواں تھا۔

صدردین کی دکان بمشکل ڈیڑھ گز چوڑی اور سات گز لمبی تھی۔ اس کے ایک کونے میں وہ خود بیٹھتا تھا اور دوسرے کونے میں اس کا چھوٹا بھائی شیرا کام کرتا تھا۔ اس مختصر سی جگہ میں بیٹھنے کی کچھ زیادہ گنجائش نکالنے کے لیے انھوں نے دکان کے آگے لکڑی کا ایک تختہ لگا لیا تھا جسے دن کے وقت لوہے کی دو سلاخیں تھامے رکھتی تھیں۔ شام کے بعد جب دکان بند کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو تختے سے سلاخیں الگ کر دی جاتیں۔ تختہ اپنی جگہ سے ہٹ کر دکان کے نیچے دیوار کے ساتھ لگ جاتا۔

یاروں کی محفل کا ایک خاص اصول یہ بھی تھا کہ وہاں کسی کو بھی امتیازی حیثیت حاصل نہیں تھی ——— جو لوگ پہلے آجاتے تھے وہ دکان کے اندر بیٹھ جاتے تھے اور جو بعد میں پہنچتے انھیں لکڑی کے اسی تختے پر جگہ ملتی بلکہ بعض اوقات یہاں بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ دوکان کے باہر ہی کھڑے رہتے تھے۔ اس اصول پر مدت سے عمل ہو رہا تھا اور کسی کو بھی اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا مگر دینو کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ محلے کی اجتماعی زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے اور اس خلا سے ہر شخص کسی نہ کسی حد تک متاثر ہے۔

دن ڈھلے کافی دیر گزر چکی تھی۔ گھروں کے چولھوں سے دھواں نکل نکل کر ایک ملگجے غبار کی طرح فضا میں پھیل رہا تھا۔ دن بھر محنت مشقت کرنے والے لوگ پیٹ بھرنے کے لیے مائی لبھاں کے تنور پر جمع ہونا شروع ہوگئے تھے اور بابا رام کے کبوتر بھی اپنے کابکوں

میں رات گزارنے کے لیے بڑی تیزی سے چھتری کی طرف آرہے تھے —— یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن دینو کی شکل کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

صدر دین اور شیرا تو بے تابی سے دینو کی راہ دیکھ ہی رہے تھے۔ ان کے علاوہ یاروں کی محفل کے دوسرے لوگوں کا بھی بُرا حال تھا۔ حسّو اس مدت میں دو تین بار تمباکو یا استری کے لیے کوئلہ خریدنے کے بہانے صدر دین کی دکان پر آکر دریافتِ حال کر چکا تھا۔ مایا رام اپنے کوٹھے پر جا کر کبوتروں کی دیکھ بھال کر رہا تھا مگر اس کی نگاہیں تو نیچے صدر دین ہی کی دکان پر جمی تھیں۔ علماں واپس آکر گو گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ تاہم وہ یہی سوچ رہا تھا کہ آج دینو کو کیا ہو گیا ہے جو اب تک ہمارے ہاں پہنچ نہیں سکا۔ کاکا چڑی مار گھر میں بیٹھنے کی بجائے صدر دین کی دکان پر بیٹھ کر مُبح استعمال کی ہوئی ڈوری کے بل نکال رہا تھا۔ نظریں اس کی بھی چوک کے اسی حصّے کو دیکھ رہی تھیں جہاں ہر روز دینو کی شکل سب سے پہلے نظر آتی تھی۔

شام ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ دینو آگیا۔ جس وقت اس نے دکان کے سامنے پہنچ کر اپنے معمول کے مطابق زور سے لاٹھی زمین پر مار کر "اسلاماں لیکم" کہا تو سب کے مرجھائے ہوئے چہروں پر تازگی آگئی۔ اب حسّو کے لیے کپڑوں پر استری کرنا مشکل تھا اور اب علماں بھی گھر میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ دونوں باہر نکل آئے تھے۔ مہتاب بھی دکان کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ مایا رام بھی کبوتروں کو جلدی جلدی کابکوں میں بند کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

گانا سننے سے پہلے کچھ دیر پھبتیاں کہنا یاروں کی محفل کا عام شیوہ تھا۔ مگر اس دن تو وہ پریشان بھی ہو گئے تھے اس لیے دینو کی کچھ زیادہ ہی تواضع کرنی چاہتے تھے۔ حسّو نے آتے ہی اس کی گردن دبوچ لی اور گرج کر کہا۔ "کیوں او مرگیا! آج مرگی پڑ گئی تھی تجھے؟"

دینو کو وقتاً فوقتاً مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ اس لیے حسّو نے اس کا نام ہی مرگیا رکھ دیا تھا۔

کاکا چڑیمار نے منہ سے ڈوری نکال کر کہا "گلا گھونٹ دو مردود کا۔ سارا دن عیش کرتا رہا ہے۔"

"کیوں اوئے مردود!؟" اور حسّو کی گرفت کچھ اور سخت ہو گئی۔ دینو کا چہرہ سرخ ہو گیا ماتھے پر شکنوں کا جال سا نظر آنے لگا اور ادھ مُوا دکھائی دینے لگا۔

"چھوڑ یار اب مر جائے گا لعین" کا کا چڑیمار بولا۔

حسّو کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ دینو نے کُرتے کے دامن سے ناک پونچھی۔ پیپڑیاں جمے ہونٹوں پر زبان پھیری اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"تجھے گلٹی نکلے ——— کسی کی آئی آئے ——— تیری ماں مر جائے" دینو نے اپنی طرف سے سب سے خوفناک بددعا دی تھی۔ ——— بالخصوص ماں کے مر جانے کی بددُعا اس وقت دیتا تھا جب وہ غم و غصہ کی آخری حد پر پہنچ جاتا تھا۔ مگر حسّو نے ایک بلند قہقہہ لگا کر اُسے گود میں اُٹھا لیا۔

"اگر پھر کبھی یہاں آیا تو سور کا بچّہ ہوں گا"

دینو کے اس چیلنج کی بھی کسی نے پروا نہ کی۔ سب ہنس ہنس کے اسے چھیڑ رہے تھے اور آنے جانے والے لوگ بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے میں محو تھے۔

حسّو دینو کو گود میں اٹھا کر اندر لے گیا۔ فحش گالیوں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ ایسے موقعوں پر صدردین کی بیوی بڑے غصّے میں زور سے دروازہ بند کر دیتی تھی اور "کنجراں دا تکیہ" اتنے زور سے کہتی تھی کہ چوک میں آنے جانے والے سب لوگ سُن لیں۔ چنانچہ اس نے اس دن بھی یہی کیا۔ علماں بولا "بس بھئی بس! آس پاس ہماری مائیں بہنیں رہتی ہیں" یہ فقرہ صدردین کی بیوی کو سنانے کے لیے کہا گیا تھا تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کو پاس رہنے والی ماؤں بہنوں کی عزت کا بڑا احساس ہے۔

حسّو نے ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"مر گیا! آج تجھے ہوا کیا تھا؟"

دینو نے اپنی ٹانگ سے تہمد ہٹا دیا۔ گھٹنے کے نیچے گوشت چوٹ کی وجہ سے نیلا پڑ چکا تھا۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے سارے ساتھیوں کو معلوم تھا کہ دینو مرگی کا مریض ہے اور مرگی کا دورہ کبھی کبھی اس کے جسم پر اپنی کوئی نہ کوئی نشانی بھی چھوڑ جاتا ہے۔ وہ اس

پر اظہار افسوس کیا کرتے ۔ یہ تو ایک عام واقعہ تھا، تاہم اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ حسو یاروں کے اصرار پر اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے دینو کے لیے آدھ سیر دودھ منگوانے پر تیار ہو گیا۔

کچھ دیر بعد دینو نے دودھ والا خالی پیالا ایک طرف رکھ دیا۔ حقے کا لمبا کش لگایا۔ ہاتھ بڑھا کر صدردین کی پشت کی جانب دکان کے کونے سے گھڑا اٹھایا اور اسے گود میں رکھ کر کچھ سوچنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد گھڑے کی آواز کے ساتھ اس کے دل کا سوز بھی سینے کی گہرائیوں سے پھوٹ پھوٹ کر آواز کی لہروں میں بہنے لگا۔

یوسف زلیخا کے چند شعر گانے کے بعد جب وہ اس شعر پر پہنچا ؎

یوسف آکھے دس زلیخا کتھے گئی جوانی
کہے زلیخا عشق تیرے تے کر دتی قربانی

تو فضا کی کیفیت ہی بدل گئی ۔ بابا رام نے اپنی آنکھیں بند کر کے سر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ یقیناً اسے اپنی جوانی کی بہاریں یاد آگئی تھیں۔ علماں سر ہلا ہلا کر آہیں بھرنے لگا۔ کاکا چڑیمار کے ہاتھ میں ڈوری پکڑی رہ گئی اور وہ ڈوری کے بل نکالنے کی بجائے زندگی کی کسی الجھن میں جکڑ کر رہ گیا۔ صدردین کا سُوا چمڑے کے دو ٹکڑوں میں سے بڑی تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے موٹے دھاگے سے ان کے کناروں کو پیوست کرنے لگا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ دینو کی آواز پر اس کے ہاتھوں میں بڑی پھُرتی آجاتی تھی۔ شیرے کو اپنی جوانی کا خیال آگیا اور اسے اپنے کنوارپن کا بڑا دکھ ہونے لگا۔ مہتاب آتش باز کو اپنا پچھلا زمانہ یاد آگیا۔ جوانی کی آگ بجھ چکی تھی مگر راکھ میں ابھی کچھ چنگاریاں زندہ تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ کھڑکھڑاتی ہوئی چھاتی پر رکھ دیا اور سینے کی ساری بلغم کو ایک ہی بار سمیٹ کر ایک گولا سا بنا کر منہ سے باہر پھینک دینے کی کوشش کرنے لگا۔ دکان سے کچھ دور جو چار پانچ بچے بڑے انہماک سے کھیل میں مصروف تھے کھیل چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دکان کے سامنے آگئے۔

دینو گاتا رہا اور اپنی دائمی محرومی کے شدید احساس سے لوگوں کے دلوں میں ایک گہرا اثر چھوڑتا رہا۔

چوک بھوررام میں رہنے والے لوگوں کی بیشتر تعداد دینو کے بارے میں صرف یہی جانتی تھی کہ

وہ موچی دروازے کے اندر کسی محلے میں رہتا ہے اور ہر روز اپنا دل بہلانے کے لیے صدر دین کی دکان پر آ جاتا ہے۔ اپنی نجی زندگی کے متعلق اس نے کبھی کچھ بتانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے بے تکلف ساتھی بھی اس کی گھریلو زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقف نہیں تھے اور نہ انھوں نے کبھی واقف ہونے کی ضرورت ہی محسوس کی تھی۔

وہ چوک دیوی دتا سے ایک میل دور موچی دروازے کے اندر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سے اوپر ہو چکی تھی۔ اور کم و بیش بیس سال سے اپنے بھائی کے مکان میں سب میں شامل ہونے کے باوجود سب سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کر رہا تھا اس کی زندگی اس مدت میں صرف تین حادثوں سے روشناس ہوئی تھی اور یہ تینوں حادثے اس کے لیے بڑے اہم ثابت ہوئے تھے۔

پہلا حادثہ اس کی پیاری ماں کے انتقال کا حادثہ تھا۔ ساری دنیا میں صرف ماں ہی اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس کا یہ سہارا بھی ختم ہو گیا تھا۔

دوسرا حادثہ اس وقت رونما ہوا تھا جب اس کا باپ ہمیشہ کے لیے دنیا سے چلا گیا تھا۔ اس حادثہ کے بعد وہ اپنے آبائی مکان سے نکل کر بھائی کے مکان میں رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

تیسرا حادثہ ایک اتفاقی واقعہ تھا!

ایک دن وہ دہلی دروازے کے باہر اپنے بھائی کی دکان پہ بیٹھا تھا کہ اس کی دوستی صدر دین موچی سے ہو گئی۔ اس کا بھائی چمڑے کا بیوپاری تھا اور صدر دین چمڑا وغیرہ خریدنے کے لیے اکثر اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ دونوں پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کے کافی قریب ہو گئے۔ دینو اس زمانے میں ناقابل برداشت تنہائی محسوس کر رہا تھا اور صدر دین کو گانا سننے سے بڑی دلچسپی تھی۔ پہلی ملاقات کے چند روز بعد صدر دین اسے اپنی دکان پہ لے آیا اور پھر دوستی بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ وہ صدر دین کے باقی دوستوں سے بھی گھل مل گیا۔

یہ آخری حادثہ تھا اور اس کے بعد کوئی اور حادثہ واقع نہ ہوا۔

اس شام کے بعد پورے چار دن گزر گئے اور دینو دکان پر نہ آیا۔ مایا رام کا خیال تھا

کہ دینو کو کچھ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ یاروں کی محفل میں شریک نہیں ہو سکا۔ وہ اپنے بھائی یا کسی کے روک دینے سے نہیں رُک سکتا تھا۔ باقی لوگوں کی بھی یہی رائے تھی اور سب کے سب اس کی عدم موجودگی کو بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔

اگلے دن مہتاب نے اطلاع دی کہ مرگی کے دورے میں دینو کی ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اور اب وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا۔ یہ سن کر ہر شخص پریشان ہو گیا اور محسوس کرنے لگا جیسے اسے کوئی ذاتی صدمہ پہنچا ہے جس نے اسے نڈھال کر دیا ہے۔

سب سے زیادہ فکر حسّو کو ہوئی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ دینو کے گھر والے ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے، وہ صدر دین اور شیرے کو ساتھ لے کر دینو کے گھر روانہ ہو گیا۔ راہ میں انھوں نے کچھ پھل خریدے اور جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے دینو کے یہاں پہنچ گئے۔ حسّو حسبِ معمول کوئی فقرہ چست کرنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر دینو کی ٹانگ پر پڑی اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

دینو کی ٹانگ سوج چکی تھی اور وہ درد سے بے تاب ہو کر ہائے ہائے کر رہا تھا۔

تینوں اس کے سامنے بیٹھ گئے مگر دینو نے منہ پھیر لیا۔

"کیا بات ہے چاچا دینو؟" شیرے کی آواز ہمدردی کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

"کیا ہے؟" دینو نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

"یار ہمیں تو خبر ہی نہ ہوئی کہ تیری یہ حالت ہو گئی ہے۔" صدر دین بولا۔ دینو نے اس مرتبہ بھی ان کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا۔ خاموش رہ کر آہستہ آہستہ مجروح ٹانگ پر انگلیاں پھیرتا رہا۔

"ہائے خائے بڑا بُرا حال ہو گیا ہے چاچا کا۔ حسّو دوا لایا ہے ارمان آجائے گا انشاء اللہ۔" شیرا دینو کی تکلیف بُری طرح محسوس کر رہا تھا۔

دینو کا دل اس بات پر بھی نہ پسیجا اور شیرا اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

حسّو اب تک بڑے صبر کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ مگر اب دینو کی بے نیازی دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر دینو کی لنجی بانھ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور غصہ سے بولا۔

"بس او مرگیا! ہم تیرے نخرے دیکھنے نہیں آئے۔ سیدھی طرح بات کرتا ہے کہ مشوک

ہی بنا رہتا ہے

مارے درد کے دینو کی چیخیں نکل گئیں اور پھر دونوں طرف سے گالی گلوچ کا سلسلہ شروع ہو گیا صدر دین پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا اگر دینو کی بھابی نے گالیوں کی آواز سن لی تو نتیجہ بہت بُرا ہو گا۔ چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ حسّو کے منہ پر رکھ لیا۔

حسّو نے گالیاں دینا تو بند کر دیا مگر اسی لمحے ایک قصاب کی سی بے رحمی کے ساتھ دینو کی مجروح ٹانگ پر پل پڑا۔ اس کی انگلیاں لوہے کی سلاخ کی طرح گوشت پر دباؤ ڈالتی ہوئی شکستہ ہڈی کو جوڑنے لگیں۔ دینو اس بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا جس کے گلے پر چھری پھیری جا رہی ہو۔ صدر دین اور شیر اگھبرا گئے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ کہ اپنے دوست کو اس تکلیف سے کس طرح بچائیں، اور کس طرح حسّو کو زیادہ سختی کرنے سے منع کریں۔

"ذرا ہولے ہولے بھائی" صدر دین بولا۔

ہمدردی اور ذہنی تکلیف کی وجہ سے دونوں کے بگڑے ہوئے چہرے اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے ابھی رو پڑیں گے۔ ان کے مقابلے میں حسّو کے چہرے پر ہمدردی کا ذرہ برابر نشان بھی نظر نہ آتا تھا۔ اس کا میٹھے تیل سے لت پت ہاتھ ہڈی اور گوشت سے برابر کشتی لڑنے میں مشغول تھا۔ خدا خدا کر کے حسّو کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی۔ اس نے مجروح ٹانگ پر دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔

دینو کا رنگ درد کی شدت سے زرد پڑ چکا تھا۔ ماتھے اور ٹانگ کے اوپر جا بجا پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور کمزوری اس درجہ تھی کہ وہ وہیں چٹائی پر ڈھیر ہو گیا۔

"بس مولا! اب ٹھیک ہو جائے گا" حسّو نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔

"اللہ کرے تیری ماں مر جائے"

حسّو بے اختیار ہنس پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چلنے لگے۔ حسّو نے پھل اُٹھا کر دینو کے سامنے رکھ دیئے۔ دینو غصّے سے پیچ و تاب کھا کر اور پھل اٹھا اٹھا کر دہلیز کی طرف پھینکنے لگا ——— صدر دین اور شیرے نے انھیں جمع کیا اور چپ چاپ اس کے پاس رکھ کر باہر نکل آئے۔ ابھی وہ دروازے سے کچھ ہی دور گئے تھے کہ دینو کی آواز آئی۔ صدر دین اندر گیا اور جب باہر آیا تو اس کی

آنکھیں مسکراہٹ سے چمک رہی تھیں۔

"کیا کہتا ہے مردود؟" حسّو نے پوچھا۔

کہتا ہے شام کو میرا گھڑا لانا —— پر حسّو کو نہ لانا۔

"اچھا —— سب سے پہلے میں ہی آؤں گا" حسّو نے زور سے کہا تاکہ دینو سُن لے۔

اور وہ ہنستا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن حسّو نے دینو کا گھڑا دینو کے گھر میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد ان کا معمول ہو گیا کہ دن بھر تو کام کاج میں مصروف رہتے اور جیسے ہی سورج غروب ہوتا ان میں سے چار پانچ ضرور دینو کے ہاں پہنچ جاتے اور پھر رات گئے تک ان کا مشغلہ جاری رہتا۔

دن اسی طرح گزرتے گئے اور ان کے شغل میں کوئی فرق نہ آیا یہاں تک کہ پیغمبروں اور رشیوں کی مقدس سرزمین پر ایک لمبی اندھیری رات چھا گئی۔ اس رات کے گھرے اندھیرے میں ہندوستان کا انسان اپنے راستے سے ہٹ کر اور انسانیت سے کنارہ کشی کر کے خون آشام درندوں کی دنیا میں جا پہنچا۔ صدیوں کے ہمسائے انتہائی بے دردی کے ساتھ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے اور تہذیب و تمدن کا سب سے قیمتی سرمایہ گلی کوچوں کی گندی نالیوں میں بہنے لگا۔

دینو کو بالکل خبر نہیں تھی کہ اس کی گلی کے باہر شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے حیرت صرف اس بات پر تھی کہ اس کے ساتھی کئی دن سے اس کے پاس نہیں آ رہے۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ ابھی تک کوٹھڑی سے باہر نکلنے کے قابل بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر اس کی حالت ٹھیک ہوتی تو وہ ہر شام کو اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے کی بجائے خود دکان پہ پہنچ جاتا اور اس بے نیازی پر ان کی خوب خبر لیتا۔

اس کے ساتھی اس کے پاس نہیں آ رہے تھے مگر یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے وہ سمجھ لیتا کہ آئندہ وہ کبھی آئیں گے ہی نہیں یا وہ ان کی صحبت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہے۔ وہ ہر روز دو تین گھنٹے ان کا انتظار کرتا رہتا اور جب وہ نہ آتے تو دل کا غبار نکالنے کے لیے اکیلے ہی گھڑا بجا بجا کر گاتا رہتا اور پھر سو جاتا۔

آٹھ دن گزر گئے اور وہ اپنے ارد گرد ایک تبدیلی سی محسوس کرنے لگا۔ اس کی بھابی صبح، شام گھر کے صحن میں روٹیاں پکاتی تھی مگر اب بچے ایک دوسرے کی روٹی یا بوٹی چھین کر چیختے چلاتے نہیں تھے۔ اس کا بھائی دکان پر ضرور جاتا تھا لیکن واپسی پر حقّے کے کچھ دیر کے لیے اس کی کوٹھڑی میں نہیں آتا تھا۔ اور پھر کئی دن سے گلی کے اندر نہ تو خوانچہ فروشوں اور فقیروں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں اور نہ محلّے کی عورتیں بچوں کے معاملے میں آپس میں لڑتی ہی تھیں۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ یہ کیسی تبدیلی آ گئی تھی۔ یہ کیا ہونے والا تھا۔ دینو سوچتا تھا مگر کچھ سمجھ نہیں سکتا تھا اپنی نک چڑھی بھابی سے اس نے اس تبدیلی کی نوعیت پوچھی تو وہ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"تجھے خبر نہیں کیا ہو رہا ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہے؟"

دو شامیں اور انتظار کرتے گزر گئیں اور اس کے ساتھی نہ آئے۔ اس نے مجبور ہو کر بھائی کو آواز دی۔ بھائی اندر آ گیا۔

"کیا ہے؟" بھائی کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔

"یار میں کہتا ہوں یہ صدرا اور راکیوں نہیں آتا آج کل؟" دینو نے پوچھا۔

"شہر میں خون خرابہ ہو رہا ہے اور تجھے اپنی پڑی ہے!"

"خون خرابہ؟" دینو نے پوچھا۔

"فساد ہو رہا ہے چاچا! گھر سے باہر نہ نکلنا۔ سُن لیا ناں؟"

اور یہ کہہ کر اس کا بھائی کوٹھڑی سے نکل گیا۔

اپنی زندگی میں دو تین بار پہلے بھی اس نے فساد کا ذکر سنا تھا مگر ایسا تو کبھی ہوا ہی نہ تھا کہ کوئی شخص ڈر کے مارے گھر سے باہر ہی نہ نکلے یا گلیاں اور بازار بالکل ویران ہو جائیں۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی تبدیلی تو اس نے پہلے کبھی محسوس ہی نہیں کی تھی، یہ کیسا فساد تھا جس نے سارے کے سارے محلّے کو ایک قبرستان بنا دیا تھا۔

اس شام کو پریشانی کے عالم میں وہ آدھی روٹی بھی نہ کھا سکا۔ صرف چند لقمے حلق سے اتارنے کے بعد لیٹ گیا اور اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر سیف الملوک کے شعر گنگنانے لگا۔

صبح بیدار ہوا تو اس کی طبیعت بڑی اُداس تھی۔ اُداس طبیعت تو کئی دن سے رہتی تھی۔ مگر اس دن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے اعصاب ایک بھاری بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ اپنے ساتھیوں سے ملاقات کئے صرف دو ہفتے گزرے تھے لیکن وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ مکمل دو سال سے قید و بند کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اپنے دل کی کیفیت وہ کسے سنا سکتا تھا۔ کسی کو بھی اس کے ساتھ ہمدردی نہیں تھی۔ جن لوگوں کو ہمدردی تھی وہ نہ جانے کیوں اس سے الگ تھلگ ہو گئے تھے۔

اس کا اضطراب بڑھ گیا۔ وہ چارپائی سے نیچے اتر کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ بھابی باہر صحن میں گوشت بھون رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی بڑی بیٹی کو گالیاں بھی دیتی جا رہی تھی۔ ایسی حالت میں بھابی کو بلانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ مگر وہ اس وقت سخت بے چین ہو گیا تھا۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں آواز دی۔

بھابی نے وہیں سے کہا۔ "ہاں؟"

"میں باہر چلا جاؤں ذرا؟" دینو نے پوچھا

"یہ کیوں نہیں کہتا میں مرنا چاہتا ہوں۔ جا جا کر مر، ہم کوئی تیرے باڈی گارڈ تھوڑے ہیں؟"

دینو نے اس کا کوئی جواب نہ دیا خاموش ہو رہا اور اس بات پہ پچھتانے لگا کہ اس نے بھابی سے یہ بات پوچھی کیوں تھی۔ اس نے اپنی ٹانگیں ذرا پھیلائیں تو ایک پاؤں گھڑے سے جا لگا اس نے گھڑے کو اپنے قریب کھینچ لیا۔ اس وقت اسے صدر دین کی ایک بات یاد آ گئی۔ صدر دین نے کہا تھا۔

"دینو! تو نہیں آتا تو ہم سب بڑے اُداس ہو جاتے ہیں ہمارا کسی کام میں جی نہیں لگتا۔"———

تو اب وہ کتنے اداس ہوں گے۔ ان کا کام کاج میں کیسے جی لگتا ہوگا۔ وہ بیچارے سخت گھبرا رہے ہوں گے۔ خدا جانے ان پر کیا مصیبت ٹوٹی ہے۔ شاید صدر دین کی بوڑھی ماں مر گئی ہوگی۔ اور اسے اپنی ماں کا غم ستانے لگا۔

چند منٹ وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا پھر اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ خود ان کے پاس چلا جائے گا اور کبھی واپس اس منحوس گھر میں نہیں آئیگا۔ اور یہ سوچ کر اس کے دل کا کنول کھل اٹھا اور وہ کوٹھڑی سے باہر جا بیٹھا۔ اب اسے بھابی کے غصے کی کوئی پروا، نہ تھی کیونکہ وہ اس گھر سے ہمیشہ

کے لیے چلے جانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا اور اس وقت بھی اپنے ساتھیوں کو ارد گرد بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس کوٹھڑی میں پہنچا تو اس کے دل میں ایک نئی امنگ پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے سینے میں ایک نیا ولولہ شرر فشاں تھا اور وہی شناسا آوازیں اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھیں جو اسے دیکھتے ہی دیکھتے ایک طوفانِ نشاط بن کر اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھیں۔

دوسرے دن صبح کے وقت ابھی گھر کے تمام افراد اوپر کوٹھے ہی پر تھے کہ وہ چارپائی سے اٹھ کر دبے پاؤں اپنی کوٹھڑی میں پہنچا۔ اپنے ننجے ہاتھ سے اس نے گھڑے کو سنبھالا اور چارپائی کے نیچے سے لاٹھی نکال کر اور اسے بغل میں داب کر باہر نکل آیا۔ گھر کے قریب کسی شخص کی نظر اس پر نہ پڑی مگر جب وہ گلی سے کچھ دور گیا تو عبداللہ تمباکو فروش کی آواز اس کے کان میں آئی۔

"کہاں دینو؟"

"کہیں نہیں۔ ذرا مہر بخش کے گھر تک جا رہا ہوں۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں۔" دینو نے جواب دیا۔ مہر بخش گلی سے کچھ دور رہتا تھا اور دینو کئی بار اس کے گھر جا چکا تھا۔

"اچھا میں بھی آؤں گا۔ یار آج کل تو زندگی حرام ہو گئی ہے۔"

اور پھر عبداللہ کے پاؤں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔

پہلے جب کبھی گلی سے باہر نکلتا تھا تو ہر طرف شور برپا ہوتا تھا لیکن اس دن ایک ہُو کا عالم طاری تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ ابھی تک دکانیں کیوں بند ہیں۔ لوگ آ جا کیوں نہیں رہے۔ یہ تانگوں اور سائیکلوں کا شور کدھر گیا ؟ شاید ابھی بہت سویرا ہے۔ تو عبداللہ کیسے باہر آ گیا تھا؟

کہیں سے بھی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ صرف بھوکے کتے بھونک رہے تھے۔ یا دُور سے بار بار ترڑ ترڑ کی سی آواز آ جاتی تھی۔ جانے یہ آواز کیسی تھی اور کہاں سے آ رہی تھی۔

وہ چلتا گیا —— خاموش فضا میں صرف اسی کی لاٹھی کی آواز گونجتی رہی۔ اب وہ گھر سے کافی دُور نکل آیا تھا اور جیسے جیسے وہ گھر سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی اس کے قریب آتے جا رہے تھے۔

وہ چلا جا رہا تھا اور کتوں کا شور مسلسل اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ یکایک اس کے شانے پر ایک بوجھ سا پڑا۔

"توں کون ایں بھرا" دینو کے ہونٹوں سے نکلا۔

اس کے جواب میں ایک گرم گرم تیز چیز اس کی پشت میں دھنستی ہوئی چلی گئی۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے — کیا ہو گیا ہے — کتوں کا شور پہلے سے بھی بلند ہو گیا۔ وہ پھر لڑکھڑانے لگا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اس نے لڑکھڑا کر گھڑے کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا اور اسے چھاتی سے لگا لیا۔ دو قدم چلا اور دھم سے زمین پر گر پڑا اور پھر یکایک اس کے سارے کے سارے ساتھی اسے پکارنے لگے۔ ساری کی ساری آوازیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ ان کی آوازوں میں کتنی حرارت تھی۔ کتنا رس تھا، کتنی کشش اور قوت تھی اس کے تمام جسم میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ بیتابی سے اس کا ہاتھ زمین پر لاٹھی تلاش کرنے لگا — اسے لاٹھی مل گئی اور گھڑے کا ایک ٹکڑا بھی جسے نہ جانے اس نے کیوں اٹھا لیا تھا۔ شاید وہ اسے پورا گھڑا سمجھ رہا تھا۔ اور ایک بار پھر وہ ویران اور سنسان سڑک پر اپنے گرم گرم لہو سے نقش و نگار بناتا ہوا قدم اُٹھانے لگا — اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ اس کا سانس الجھ رہا تھا۔ مگر وہ چلا جا رہا تھا ایک طوفانی عزم کے ساتھ۔ — ایک ناقابلِ شکست ارادے کو لیے ہوئے — آخر گر گر کر سنبھلتا ہوا، سنبھل سنبھل کر گرتا ہوا وہ چوک میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی وہی خاموشی تھی۔ وہی ویرانی تھی۔

"یا اللہ یہ کیا ہو گیا ہے — میں کہاں آ گیا ہوں۔"

اور وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا جیسے ابھی ساری کی ساری آوازیں گونج اٹھیں گی — جیسے ابھی تمام کے تمام ساتھی اس کی طرف بھاگ آئیں گے۔ مگر کوئی آواز نہ گونجی۔ کوئی ساتھی اس کی طرف نہ آیا — محلّے بھر کی زندگی ڈر کے مارے مکانوں کی چار دیواری کے پیچھے جا چھپی تھی — "صدرے!" اس نے گرتے گرتے آواز دی۔ دوبارہ آواز دی اور پھر گر پڑا۔ دکان کے عین سامنے۔ اس کی خون آلود انگلیاں کئی لمحے دکان کے نیچے لکڑی کے تختے کو مس کرتی رہیں — اور "صدرے صدرے" کہتی ہوئی ایک مضمحل سی باریک آواز اس کے منہ سے نکلتی رہی ؞

انتخاب طلسم ہوش ربا

''اٹھے نہ چھوڑ کے ہم آستانِ بادہ فروش
طلسم ہوش ربا ہے دکانِ بادہ فروش''

—— شیفتہ

''طلسم ہوش ربا کے کھلے میدان خواہشات کی فوری تکمیل اور تسکین کا ایک معنی خیز حربہ ہیں۔

—— ڈاکٹر وحید قریشی

''دنیا میں اور کہیں اتنا بڑا رزم نامہ نہیں ملے گا''۔

—— مجنوں گورکھپوری

''طلسم ہوش ربا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے۔ اگر اردو انشا پرداز اس طرف متوجہ ہوتے تو انہیں بے شمار نقوش، تصاویر، تلمیحات پر دست رس ہوتا اور ان چیزوں سے مصرف لے کر وہ اپنی تصنیفوں کو سجا سکتے''

—— کلیم الدین احمد

مکتبہ میری لائبریری
چوک اردو بازار لاہور ۲

میرزا ادیب ۱۹۳۵ء سے مسلسل اپنی ذہنی کاوشوں سے اُردو ادب میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ان کی ادبی تخلیقات اپنے اندر جہاں بڑی وسعت رکھتی ہیں وہاں ان میں تنوع بھی ہے انہوں نے رُومانی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ مختصر افسانے بھی، ڈرامے بھی، خاکے بھی، تنقید بھی، سفرنامہ بھی اور خود نوشت سوانح عمری بھی۔

میرزا ادیب کو یہ خصوصی امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے سترہ سال تک برِصغیر کے بُلند پایہ ادبی رسالے 'ادبِ لطیف' کے ادارتی فرائض بھی نہائیت خوش اسلوبی سے ادا کیئے ہیں سات جلدیں "بہترین ادب" کی بھی مرتب کی ہیں، کئی کہانیوں اور مضامین کے تراجم بھی کیئے ہیں۔

میرزا ادیب کو اپنی تصانیف پر سب سے زیادہ ادبی انعام ملے ہیں۔ حسن کارکردگی کا صدارتی تمغہ بھی انہیں مل چکا ہے۔

میرزا صاحب کا کام کم و بیش ترپّن ۵۳ برسوں پر محیط ہے اور یہ فخر پاک و ہند کے بہت ہی کم اہلِ قلم کو حاصل ہوا ہے۔

"میرزا ادیب کا ادب" بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے "زندہ رہنے والا ادب ہے یہ ادب کبھی ماضی کا فراموش شدہ ادب نہیں بنے گا۔"

اِس کتاب میں آپ میرزا صاحب کے نمائندے افسانے پائیں گے۔ ان افسانوں کا انتخاب اُردو کے نامور اور مُمتاز نقاد پروفیسر عرش صدیقی نے کیا ہے۔

مکتبہ میری لائبریری
اُردو بازار۔ لاہور-۲

بشیر احمد چودھری

مرتّب: عرش صدیقی

۱۹۲۷ء میں گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ انگریزی میں ایم اے کیا، شاعری اور افسانہ نگاری سے گہری دلچسپی ہے۔ افسانوں کے مجموعہ "باہر کفن سے پا پر ادبی انعام پا چُکے ہیں۔

اِن دنوں بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی ملتان میں رجسٹرار کے عہدے پر فائز ہیں۔